READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
فروری 2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

حمد باری تعالیٰ

دونوں جہاں کے مالک سچا ہے نام تیرا
ہم ہیں خطا کے پتلے بخشش ہے کام تیرا
ہندو ہو یا مسلماں یا پارسی مسیحی
جھکتے ہیں تیرے آگے لیتے ہیں نام تیرا
ادنیٰ ہو یا ہو اعلیٰ ، گورا ہو یا ہو کالا
ہر اک ہے بندہ تیرا ہر اک غلام تیرا
ہو ترک یا عرب ہو ، شرقی ہو یا ہو غربی
ہر اک پہ ہو رہا ہے فیضان عام تیرا
جنّ ہوں کہ ہوں فرشتے ، ہوں جانور کہ انساں
گن گا رہے ہیں یا رب سب صبح و شام تیرا
علم و عمل کی بستی ہو گی وہ نیک ہستی
جس دل میں یا الٰہی ہو گا مقام تیرا
شمس و قمر ستارے کیا جا بجا ہیں سارے
بدلا کبھی نہ ہرگز یا رب نظام تیرا

......☆......

نعت رسولِ مقبول ﷺ

روحِ روانِ گلستاں صلِ علیٰ محمد
یعنی بہارِ دو جہاں صلِ علیٰ محمد
راہ نمائے عارفاں مقصدِ علم سالکاں
صادق و جانِ صادقاں صلِ علیٰ محمد
آپ کو جس نے پا لیا اس نے خدا کو پا لیا
منزلِ راہِ انس و جان صلِ علیٰ محمد
آپ ہی کی ضیا سے ہے کون و مکاں میں روشنی
صبحِ مرادِ عاشقاں صلِ علیٰ محمد
بندہ نواز و مہرباں پشت پناہِ عاصیاں
مالکِ لطفِ بیکراں صلِ علیٰ محمد
ٹلتی ہے اس کی ہر بلا ہوتا ہے اس سے خوش خدا
پڑھتا ہے جو کہ ہر زماں صلِ علیٰ محمد

......☆......

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ اعمال میں سے ایک عمل یہ بھی ہے کہ جو بھی اچھا کام ہے اس کی ابتدا دائیں طرف سے کی جائے۔ نبی پاک ﷺ تمام اچھے کاموں میں دایاں ہاتھ استعمال کرنے کا حکم فرماتے۔ احادیث طیبہ اور آپؐ کی سیرت مبارکہ سے اس کی واضح راہنمائی ملتی ہے۔

☆..... حضرت عائشہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ اپنے تمام کاموں (جیسے) وضو کرنے، کنگھی کرنے اور جوتے پہننے میں دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے۔''
(بخاری، کتاب الوضوء:426، مسلم، کتاب الطہارۃ:268)

☆..... حضرت عائشہؓ ہی ارشاد فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کا دایاں ہاتھ تو آپؐ کے وضو اور کھانے کے لیے اور آپؐ کا بایاں ہاتھ استنجاء اور دوسرے کاموں (جیسے ناک صاف کرنا وغیرہ) کے لیے استعمال ہوتا تھا۔'' (ابوداؤد، کتاب الطہارۃ:33)

☆..... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب تم لباس پہنو اور وضو کرو تو داہنی طرف سے شروع کرو۔'' (ابوداؤد، کتاب اللباس:4141)

☆..... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو دائیں طرف سے شروع کرے اور جب جوتا اتارے تو بائیں طرف سے شروع کرے۔ جوتا پہنتے وقت دایاں پاؤں پہلے ہو اور جوتا اتارتے وقت اسے آخر میں ہونا چاہیے۔'' (بخاری، کتاب اللباس:5855)

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی آپؐ وضو شروع فرماتے تو دائیں طرف سے شروع فرماتے۔ یعنی پہلا دایاں ہاتھ دھوتے۔ اسی طرح غسل اور تیمم میں بھی دایاں ہاتھ مقدم ہوگا۔ وضو اور غسل میں مسواک کرنا بھی سنت ہے تو مسواک کو دائیں ہاتھ میں لینا چاہیے۔ اگر آپ ٹوتھ برش کرتے ہیں تو اس کو بھی دائیں ہاتھ میں لینا چاہیے۔ نیز مسواک اور برش پہلے دائیں جانب کے دانتوں میں کی جائے گی۔ سر کے بالوں میں تیل لگانا ہو یا بال سنوارنے کے لیے کنگھی کی ضرورت ہو تو پہلے دائیں طرف تیل لگائے اور کنگھی کرے۔

جوتا پہننے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دائیں جوتے میں دایاں قدم داخل کرے اور پھر بائیں جوتے میں بایاں قدم داخل کرے۔ اور جوتا اتارنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بائیں جوتے سے قدم نکالے اور پھر دائیں جوتے سے قدم نکالے۔

کپڑے پہننے کا طریقہ یہ ہے کہ جب قمیص یا سویٹر پہنے تو پہلے دایاں ہاتھ دائیں آستین میں داخل کرے اور پھر بایاں ہاتھ بائیں آستین میں داخل کرے اور اتارتے وقت اس کے برعکس ہو گا کہ پہلے بایاں ہاتھ قمیص کی آستین سے نکالے اور پھر دایاں۔ اسی طرح پاجامہ پہننے اور اتارنے کا طریقہ ہے۔

پیشاب اور پاخانہ کرنے کے بعد استنجا کرتے ہیں تو اس میں صفائی کے لیے بایاں ہاتھ استعمال کیا جائے گا۔ اسی طرح ناک صاف کرنے کے لیے بھی بایاں ہاتھ استعمال کیا جائے گا۔ تھوکنے کی حاجت ہو تو بائیں جانب تھوکے البتہ یہ خیال رکھے کہ ایسی جگہ نہ تھوکے جہاں راہ گزر کو تکلیف ہو یا وہ جگہ لوگوں کے بیٹھنے کی ہو۔ واش بیسن میں بھی تھوکے تو پانی اچھی طرح بہا دے کہ تھوکے کے آثار باقی نہ رہیں اور دوسروں کو اس سے تکلیف اور ناگواری نہ ہو۔

نبی پاکؐ نے یہ بھی حکم فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھایا اور پیا جائے اور آپؐ نے بائیں ہاتھ سے کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی بائیں ہاتھ سے نہ کھائے اور نہ بائیں ہاتھ سے پیئے کیوں کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔''
(مسلم، کتاب الاشربۃ:2020)

پیارے بچو! اگر ہم ذرا سی توجہ کر لیں اور عادت ڈالنے کی کوشش کر لیں تو یہ تمام کام اجر و ثواب کا باعث ہوں گے اور ان کی اتباع سے سنت کا نور بھی حاصل ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ! ☆☆☆

جھیل کے ٹھنڈے پانی کی سطح پر ایک شکارا تیر رہا تھا۔ شکارے پر ایک ماہی گیر کھڑا آزادی کا نغمہ گا رہا تھا مگر اس کی آواز میں دکھ تھا، سوز تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کنارے کے دوسری طرف ایک گاؤں کے کسی گھر میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ یہ دھواں اس بات کی علامت تھا کہ مقبوضہ وادی کا ایک اور ہنستا بستا گھر برباد ہو چکا ہے۔ دشمن فوج کے اسلحہ و بارود نے اس گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ وہ بچپن سے ایسے مناظر دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ گھر جلتے تھے، لوگ مرتے تھے۔ کھیتیاں برباد ہوتی تھیں، مگر آزادی کا جذبہ دم نہیں توڑتا تھا۔ ایک شہید ہوتا تھا تو دس کھڑے ہو جاتے تھے۔ بھارتی فوج مظالم کر کر کے تھک چکی تھی، مگر کشمیری حریت پسند ظلم سہہ سہہ کر بھی تھکے نہیں تھے۔ ان کے جوش اور ولولے میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

وہ ماہی گیر اپنے گھر واپس لوٹا تب بھی بہت اداس تھا۔

''کیا ہوا ابو جی......'' اس کی معصوم بیٹی رابعہ اس کے پاس چلی آئی تھی۔

''آج انہوں نے ایک اور گھر اُجاڑ دیا......'' اس ایک جملے میں رابعہ ساری بات سمجھ چکی تھی۔

''کب تک ابو جی...... آخر کب تک......'' رابعہ بولی تھی۔ اس سوال کا جواب ابو کے پاس موجود نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگے آخر اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ اتنے میں ایک آواز اُن کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں...... میں...... میں...... رابی...... کاشیر...... کاشمیر......'' یہ مٹھو تھا گھر بھر کی آنکھ کا تارہ...... آٹھ ماہ پہلے رابعہ کے ابو کو یہ طوطا کھیتوں میں ملا تھا۔ جانے کیوں وہ اُڑ نہیں پا رہا تھا۔ اس وقت وہ بچہ ہی تو تھا۔ ابو نے سوچا کہ کوئی جنگلی یا پھر پالتو جانور اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بس اس خوف کی وجہ سے وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ ابو جانتے تھے کہ یہ بچہ طوطا، طوطوں کی اس خاص نسل سے تعلق رکھتا ہے جس پر اگر تھوڑی سی محنت کی جائے تو وہ انسانوں کی طرح بولنے کا سلیقہ سیکھ جاتا ہے۔ پہلے دن ہی رابعہ کی طوطے کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ بچے تو ویسے بھی پرندوں کے ساتھ بہت پیار کرتے ہیں۔ اب رابعہ اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ طوطے کا پنجرہ کمرے کی چھت کے ساتھ ضرور لٹکا ہوا تھا مگر پنجرے کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ آزاد ہونے کے باوجود وہ یہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا دل اس گھر اور رابعہ کے ساتھ لگ چکا تھا۔ رابعہ روزانہ اس کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔ اسے الفاظ کی ادائیگی کا طریقہ سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔

''ہاں مٹھو۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ رابعہ۔۔۔۔۔ رابعہ۔۔۔۔۔'' سب سے پہلے وہ مٹھو کی زبان سے اپنا نام سننا چاہتی تھی۔ مٹھو ٹیں۔۔۔۔۔ ٹیں کرتا رہتا تھا۔ پھر ایک دن مٹھو بولا:

''ٹیں۔۔۔۔۔ ٹیں۔۔۔۔۔ رابی۔۔۔۔۔ رابی۔۔۔۔۔'' رابعہ تو خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ اس کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ پھر مٹھو کشمیر کو کاشمیر۔۔۔۔۔ کاشمیر کہنا بھی سیکھ گیا۔ اب مٹھو کی آواز سن کر ابو کو رابعہ کے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

''رابی۔۔۔۔۔ رابی۔۔۔۔۔ کاشمیر۔۔۔۔۔ کاشمیر۔۔۔۔۔''

''کہو مٹھو۔۔۔۔۔ پاکستان۔۔۔۔۔ پاکستان۔۔۔۔۔'' اب ابو بھی مٹھو کو سکھا رہے تھے۔ رابعہ کے سوال کا یہی جواب تھا کہ پاکستان کی سفارتی کوششوں سے ہی کشمیر کی آزادی ممکن ہے اور ابو جانتے تھے کہ پاکستان کی طرف سے یہ کوشش ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ اسی لیے تو مقبوضہ وادی میں پاکستان کا پرچم لہرانے کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔

اس تحریک کو کچلنے کے لیے بھارتی فوج پورا زور لگا رہی تھی۔ آزادی کے متوالے پرچم لہرا کر پاکستان کے ساتھ اپنی یک جہتی کا اظہار کرتے تھے۔ کتنے ہی زخمی ہوتے تھے۔ کتنے ہی جیلوں میں بند ہوتے تھے مگر ارادہ کمزور نہیں پڑتا تھا۔ رابعہ کو ابھی ان تمام باتوں کی سمجھ نہیں تھی مگر آزادی وہ بھی چاہتی تھی۔ بھارتی افواج کے ظلم و ستم سے نجات وہ بھی چاہتی تھی۔ امن کے ساتھ زندگی وہ بھی بسر کرنا چاہتی تھی۔

ایک دن رابعہ نے اپنے ابو سے ایک ایسی چیز کی فرمائش کی کہ ابو کا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔ خوف ان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اک سرد لہر ان کے خون میں سرایت کر گئی تھی۔

''ابو جی! پاکستان کا پرچم کیسا ہوتا ہے؟''

''سبز رنگ کا ہوتا ہے بیٹا۔۔۔۔۔ پرچم کا تھوڑا حصہ سفید رنگ کا بھی ہوتا ہے۔ درمیان میں سفید رنگ کا چاند اور ستارہ بھی ہوتا ہے۔'' وہ مسکرائے تھے۔ ''یہ پرچم کہاں سے ملتا ہے؟'' رابعہ نے دوسرا سوال پوچھا تھا۔

''پاکستان میں تو ہر جگہ سے مل جاتا ہے مگر۔۔۔۔۔'' ابو جی کچھ سوچنے لگے تھے۔ رابعہ بات مکمل ہونے کی منتظر تھی۔

''مگر یہاں خود سینا پڑتا ہے۔ کسی درزی سے تیار کروایا جا سکتا ہے۔'' اب جو رابعہ نے سوال پوچھا تو ابو کو چکر آ گیا۔

''کیا آپ مجھے پاکستان کا پرچم لا دیں گے؟''

''پاکستان کا پرچم۔۔۔۔۔ تم کیا کرو گی؟'' ابو پریشان ہو گئے تھے۔

''پاکستان کا پرچم میں اپنے گھر کی چھت پر لہراؤں گی۔ پھر ہمیں آزادی مل جائے گی۔'' رابعہ کے معصوم چہرے پر مسرت کی چمک تھی۔ ابو چاہ کر بھی رابعہ کی اس فرمائش کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہر عمل کا ایک ردِعمل ہوتا ہے۔ اس عمل کا ردِعمل بہت بھیانک ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنا گھر اور گھر والوں کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اپنے انکار سے رابعہ کی خواہش کا گلا دبا دیں کہ اچانک ایک آواز کمرے میں گونجی۔

''ٹیں۔۔۔۔۔ ٹیں۔۔۔۔۔ رابی۔۔۔۔۔ کاشمیر۔۔۔۔۔ پاکستان۔۔۔۔۔'' رابعہ کی محنت رنگ لائی تھی۔ مٹھو نے پاکستان کہنا بھی سیکھ لیا تھا۔

''بیٹے ابو بیٹے۔۔۔۔۔ مٹھو بھی پاکستان کا پرچم مانگ رہا ہے۔۔۔۔۔''

''اچھا بیٹا۔۔۔۔۔ لا دوں گا۔۔۔۔۔'' ابو کی آواز گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی تھی۔ پھر دن گزرنے لگے۔ رابعہ کا اصرار اب ضد بننے لگا تھا۔ اس نے اپنی امی سے بھی کہا تھا کہ سلائی مشین پر پاکستانی پرچم سی دیں مگر امی بھی ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ اب وہ اداس رہنے لگی تھی۔ اسے اپنے سوالوں کے جوابات نہیں مل رہے تھے۔ ایسے میں وہ مٹھو کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔

''مٹھو۔۔۔۔۔ امی ابو نے ہمیشہ میری ہر خواہش کو پورا کیا ہے۔ اب کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔؟''

''ٹیں۔۔۔۔۔ ٹیں۔۔۔۔۔ رابی۔۔۔۔۔ کاشمیر۔۔۔۔۔ پاکستان۔۔۔۔۔''

''ہم غلام ہیں۔۔۔۔۔ آزادی کے لیے کوشش تو کرنا ہو گی نا۔۔۔۔۔''

''ٹیں۔۔۔۔۔ ٹیں۔۔۔۔۔ رابی۔۔۔۔۔ کاشمیر۔۔۔۔۔ پاکستان۔۔۔۔۔'' مٹھو ایک ہی راگ الاپ رہا تھا۔

''مگر میں ہار نہیں مانوں گی۔ میں دیکھنے والوں کو ضرور بتاؤں گی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ میں اس راستے پر چلوں گی۔ ابو نے بتایا تھا کہ پاکستانی پرچم سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ میں اپنے سبز دوپٹے کو ہی پرچم بنا لوں گی۔۔۔۔۔ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔''

''ٹیں۔۔۔۔۔ ٹیں۔۔۔۔۔ رابی۔۔۔۔۔ کاشمیر۔۔۔۔۔ پاکستان۔۔۔۔۔'' مٹھو نے اپنے پَر پھیلائے تھے۔ رابعہ الماری کی طرف بڑھ گئی تھی۔

رابعہ کے ابو اپنے شکارے پر کھڑے تھے کہ کوئی زور سے بولا۔

''اے الیاس۔۔۔۔۔ اپنے گھر کی خبر لو۔۔۔۔۔ تمہارے گھر کی چھت پر پاکستانی پرچم لہرا رہا ہے اور کسی مخبر نے بھارتی فوج کو اطلاع بھی

دے رہی ہے۔ فوج کا ایک یونٹ گاؤں میں داخل ہو چکا ہے۔'' یہ گاؤں کا کوئی آدمی تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے الیاس کو خبر دینے آیا تھا۔ الیاس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اُتر آئے تھے۔ اس نے طوفانی رفتار سے اپنا کام سمیٹا تھا اور پھر اپنے گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ گاؤں میں بھارتی فوجی دندناتے پھر رہے تھے۔ کرفیو جیسا سماں تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر رہ گئے تھے اور پھر الیاس نے ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ اس کے گھر کی چھت پر رابعہ کا سبز دوپٹہ پاکستانی پرچم بن کر لہرا رہا تھا اور نیچے آگ جل رہی تھی۔ بھارتی فوجیوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی تھی اور اس کے گھر کے تمام افراد گھر کے اندر بند تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ روتے روتے اپنے جلتے گھر کی طرف لپکا مگر آگ کی لپٹیں اسے راستہ نہیں دے رہی تھیں۔ بھارتی فوجی قہقہے لگا رہے تھے۔ اب الیاس دیوانہ وار ایک بھارتی فوجی کی طرف لپکا۔

''ظالمو......'' اس سے پہلے کہ الیاس کچھ اور کہتا اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے آگ کا ایک انگارہ اس کی کمر میں گھس گیا ہو۔ ایک بھارتی فوجی نے اسے گولی مار دی تھی۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اس نے اپنا سر گھما کر دیکھا۔ اس کا گھر دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ پھر اس کے کانوں سے پھڑپھڑاہٹ کی آواز ٹکرائی۔ یہ مٹھو تھا۔ وہ الیاس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''ٹیں...... ٹیں...... راوی...... کاشمیر...... پاکستان......''

''جاؤ...... مٹھو...... جاؤ...... یہ پیغام پاکستان...... پاکستان تک پہنچا دو۔'' اتنا کہہ کر الیاس نے دم توڑ دیا تھا۔

''پکڑ لو اس پرندے کو...... یہ بھی پاکستان کا نام لیتا ہے۔'' کسی فوجی نے چلا کر کہا تھا۔ سب دائرہ بنا کر مٹھو کی طرف لپکے تھے۔ مٹھو پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑنے لگا تھا۔

''گولی مار دو اس پرندے کو......'' بھارتی فوجیوں نے مٹھو پر فائر کھول دیا تھا مگر مٹھو اڑتے ہوئے غوطہ لگا کر درختوں کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بھارتی فوجیوں کے کانوں سے مٹھو کی آواز اب بھی ٹکرا رہی تھی۔

''راوی...... کاشمیر...... پاکستان......''

اب مٹھو پاکستانی سرحد کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ یہاں بھارتی افواج کا کڑا پہرہ تھا۔ دو فوجی اس وقت فضا میں معلق ایک چوکی میں موجود تھے۔ ایسے میں ایک فوجی کو سرحد کے اوپر ایک طوطا پرواز کرتے ہوئے دکھائی دیا۔ اس نے فوراً اپنی بندوق سیدھی کر لی۔ اب وہ مٹھو کو نشانہ بنا رہا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' اس کے ساتھی نے پوچھا تھا۔

''ایک منٹ...... بتاتا ہوں۔'' پھر فضا میں ایک دھماکے کی آواز گونجی۔ مٹھو نے غوطہ لگایا تھا۔ اس کے پر فضا میں اڑنے لگے تھے۔ وہ سرحد کے دوسری طرف جا گرا تھا۔

''وہ مارا......'' بھارتی فوجی خوشی سے چیخ پڑا تھا۔

''یہاں سے کوئی انسان تو کیا پرندہ بھی سلامتی کے ساتھ دوسری طرف نہیں جا سکتا۔'' اس نے اتراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی، مگر یہ اس کی بھول تھی۔ مٹھو زندہ تھا۔ گولی اس کے بازو کے نیچے موجود پروں کو جلا کر نکل گئی تھی مگر وہ اب بھی اُڑنے کے قابل تھا۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے بعد وہ اڑا اور پھر اُڑتا ہی چلا گیا۔ رات اس نے ایک درخت کی شاخ پر گزاری تھی۔ اگلے دن پھر سے سفر کا آغاز ہوا اور پھر وہ پاکستان کے پہلے سرحدی گاؤں میں پہنچ گیا۔ ایک گھر کی منڈیر پر بیٹھ کر اس نے اپنے پر پھیلائے اور تیز آواز میں بولا۔

''ٹیں...... ٹیں...... راوی...... کاشمیر...... پاکستان۔'' پھر وہ یہ جملہ بار بار دہرانے لگا۔ لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ وہ اس بولنے والے طوطے کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر مٹھو ٹیں...... ٹیں کرتا اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مٹھو کا سفر ابھی جاری ہے۔ اس کے ایک طرف کے چند پر جلے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی دن وہ آپ کے گھر کی منڈیر پر آ کر بیٹھے اور بولے۔

''راوی...... کاشمیر...... پاکستان......'' اس کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش ضرور کیجیے گا۔ ☆☆☆

اوّلین القاب یافتہ لوگ

سب سے پہلے خلیفہ کا لقب حضرت صدیق اکبرؓ کو ملا۔ خلیفۃ الرسول صرف آپؓ کو کہا جاتا ہے ☆ سب سے پہلے امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظمؓ کو کہا گیا ☆ سب سے پہلے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا لقب قاضی ابو یوسف کو ملا ☆ سب سے پہلے وزیر، ابو سلمہ حفص بن سلیمان الخلال کو کہا گیا جو کہ ابو العباس سفاح کے وزیر تھے ☆ سب سے پہلے سلطان کا لقب محمود غزنویؒ کو ملا ☆ سب سے پہلے ملک، عضد الدولہ ناخسرو کو کہا گیا ☆ سب سے پہلے الامیر الکبیر کا لقب مصر میں شیخو کو ملا۔ (فدا حسین قادری، خیرپور)

روحی اصغر

سزا

اسد ایک شریر لڑکا تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، لہٰذا بہت خودسر اور ضدی بھی تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ والدین کی نصیحت بھی اس پر اثر نہ کرتی تھی۔ غرور تو اس کی نس نس میں بھرا ہوا تھا۔ ہمیشہ نوکروں پر رعب جماتا اس کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ مجال ہے جو پانی کا گلاس خود سے اُٹھ کر پی لے۔ اس کے دادا جان معذور تھے۔ وہ اپنے کسی بھی کام کے لیے دوسروں کو آوازیں دیا کرتے تھے۔ اسد کو بھی کبھی کبھار کام کا کہہ دیتے تھے۔

''اسد بیٹا! ذرا پانی تو پلا دو۔'' دادا جان لجاجت سے کہتے۔

''دادا جان! میں اپنا ہوم ورک کر رہا ہوں۔'' وہ ٹکا سا جواب دے کر پھر کتاب پر سر جھکا لیتا تھا۔

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ اب وہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں جا چکا تھا۔ کالج کے ماحول میں اسکول کی نسبت آزادی ہوتی ہے، لہٰذا کھلنڈرے اور غیر سنجیدہ دوستوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا۔

کالج جاتے ہوئے اسے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ ابا جان اسے گاڑی پر کالج چھوڑ آتے تھے۔ اسد کے دوستوں کے پاس موٹر بائیک تھی۔ وہ خوب ہلا گلا کرتے۔ سڑکوں پر شتر بے مہار کی طرح موٹر سائیکل دوڑاتے پھرتے تھے۔ اسد بھی ان کے ساتھ خوب مزے کرتا تھا۔

''ابا جان! مجھے بھی موٹر بائیک چاہیے۔''

اسد نے ضدی لہجے میں مطالبہ کیا۔

''بیٹا! آپ کو موٹر بائیک کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کو کالج چھوڑ کر تو آتا ہوں۔'' ابا جان نے سمجھانے کی کوشش کی۔ بحث و تکرار ہوتی رہی۔ آخرکار اولاد کا پیار والدین کی احتیاط اور نصیحت پر غالب آ گیا۔ ابا جان نے مارکیٹ جا کر اسے موٹر بائیک لے دی۔ چمکتی دمکتی موٹر بائیک دیکھ کر اسد کو تو پر لگ گئے۔ وہ فوراً موٹر بائیک نکالنے لگا۔ گیراج میں موٹر بائیک اسٹارٹ کی تو لان میں دادا جان وہیل چیئر پر بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دور سے آواز دی اور اسے پانی کے لیے پکارا۔

''دادا جان میں باہر جا رہا ہوں کسی اور سے پانی مانگ لیں۔'' اسد نے بدتمیزی سے جواب دیا۔

......☆......

تینوں دوست گھنٹوں سڑکوں پر ون ویلنگ کرتے رہے۔ ایک مرتبہ تو ان کو شدید چوٹیں بھی آ گئیں۔ دادا جان کو پتا چلا تو انہوں

نے اسد کو سختی سے سمجھایا لیکن اسد نے نہایت بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔

"دادا جان! آپ تو ہر وقت وہیل چیئر پر بیٹھے رہتے ہیں آپ کو کیا پتا ون ویلنگ میں کتنا تھرل (Thrill) ہے۔"

"بیٹا! تندرستی بہت بڑی نعمت ہے۔ اپنے تندرست جسم اور مکمل اعضا کی قدر کرو۔ مجھے دیکھو میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہوں، بے بس اور محتاج ہوں۔"

"دادا جان! کچھ نہیں ہوتا۔ ہر وقت آپ کی نصیحتیں سن سن کر میں اکتا گیا ہوں۔"

فیصل اور داؤد کے پاس بھی موٹر بائیک تھی لیکن ابراہیم کے پاس نہیں تھی۔ ابراہیم ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کے والدین بمشکل اس کی پڑھائی کا خرچ اٹھاتے۔ والدین کو ابراہیم سے بہت سی توقعات تھیں۔ ابراہیم کالج کے بعد بھی ایک اسٹور پر کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ میں وہ اپنا خرچ خود اٹھا لیتا تھا۔ دونوں دوست ابراہیم کو زبردستی اپنے گروپ میں شامل کر لیتے تھے۔ ابراہیم ان کے لیے بہت فائدہ مند تھا۔ وہ نوٹس بنا کر انہیں دیتا تھا۔

ابراہیم بھی کبھی کبھار موٹر بائیک پر سواری کر لیا کرتا تھا۔ فیصل، اسد اور داؤد اسے گھر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ یہ سب دوست اب ایف اے کر چکے تھے۔ ابراہیم نے پوزیشن لی تھی لیکن فیصل اسد اور داؤد بمشکل پاس ہوئے تھے۔ اسد دولت مند باپ کا بیٹا تھا لہٰذا پوزیشن کی اسے پرواہ نہ تھی، لیکن ابراہیم کے والدین اس کی کامیابی پر بہت مسرور تھے۔

"ابراہیم! تم نے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے۔ آخر محنت مزدوری تو کرنی پڑے گی تمہیں دولت کمانے کے لیے۔" اسد نے تکبر سے گردن اکڑا کر کہا۔

"اسد! میں والدین کا واحد سہارا ہوں۔ میں نے اپنے گھر کا بوجھ اٹھانا ہے۔ میری زندگی کی کوئی وقعت نہیں لیکن میرے والدین کے لیے میری جان بہت معنی رکھتی ہے۔"

"اچھا! سب باتیں چھوڑو، موٹر بائیک پر سیر کو چلتے ہیں۔ فیصل اور داؤد کو بھی لے لیں گے۔" اسد نے کہا۔

"نہیں اسد! تم بہت تیز چلاتے ہو۔ جب تم اکٹھے ہوتے ہو تو تم مقابلے پر آ جاتے ہو۔ اب تو تم لوگ ون ویلنگ کرنے لگے ہو۔" یہ کہہ کر ابراہیم نے انکار کر دیا۔

☆......☆

گرمیوں کی شام تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم بہت سہانا تھا۔ گھنے، سیاہ بادل برسنے ہی والے تھے۔ ابراہیم آج بہت خوش تھا کیوں کہ اس کی بہن کی منگنی تھی۔ سارے انتظامات اس نے کرنے تھے۔ وہ بہت مسرور تھا اور بہت مصروف بھی۔

وہ اپنے دوستوں کو منگنی کی تقریب میں مدعو کرنا چاہتا تھا۔ اسد، فیصل اور داؤد کالج میں تھے۔ لہٰذا ابراہیم نے انہیں بھی تقریب میں آنے کی دعوت دی۔

"مبارک ہو ابراہیم!" سب نے اسے مبارک دی۔

"کیوں نہ اس خوشی میں لونگ ڈرائیونگ کریں۔" اس نے آئیڈیا دیا۔ دونوں دوستوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ابراہیم نے انکار کر دیا لیکن ان سب کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

اب چاروں دوست موٹر بائیک پر سوار سڑک پر نکل آئے۔ ابراہیم، اسد کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اسد نے موٹر بائیک اسٹارٹ کی۔ فیصل اور داؤد جب سڑک کے درمیان پہنچے تو یکایک انہوں نے ون ویلنگ شروع کر دی۔ ویسے تو اسد کی گرفت، ہینڈل پر مضبوط تھی لیکن جب اگلا پہیہ اوپر اٹھا تو اس کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی۔ ابراہیم کا رنگ فق ہو گیا۔ اسد نے موٹر بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی۔ اب ابراہیم نے چلانا شروع کر دیا اور اسے رکنے کا کہا، لیکن اس نے ہارنا تو سیکھا نہ تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے آگے نکلنا چاہتا تھا۔

بارش کی وجہ سے سڑک پر پھسلن ہو گئی تھی۔ ابراہیم کے منع کرنے کے باوجود اسد باز نہ آیا۔ سڑک پر جب فیصل اور داؤد اس کے قریب آئے تو اسد نے اتراہٹ سے ون ویلنگ کے کرتب دکھانے شروع کر دیئے۔ سڑک پر چرچراہٹ کی زوردار آواز گونجی۔ اسد کی بائیک سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ بدقسمتی سے یوٹرن تھا۔ آگے سے آنے والی گاڑی سے زور سے ٹکرا کر بائیک دور جا گری تھی۔ ابراہیم بھی سڑک پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆

اس نے چیخ پکار سے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔

"ہے کوئی جو مجھے پانی پلا دے۔" اس نے بے بسی سے نوکروں کو آواز دی۔

سبھی نوکر اس کے کمرے سے دور اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ امی جان قریب موجود نہ تھیں۔

دن ویلنگ کے اس بھیانک حادثے میں اسد دونوں ٹانگوں سے معذور ہو چکا تھا۔ دادو، فیصل اور ابراہیم کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ابراہیم کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے بازو سے محروم ہو چکا تھا۔

اسد پھر درد سے چلایا۔

"میری آواز سنو، مجھے پانی پلا دو۔"

اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اس نے بے بسی سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اسے اپنی پیشانی پر گرم بوسے کا احساس ہوا۔ دھیرے سے آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا کہ دادا جان وہیل چیئر پر ہاتھ میں پانی کا گلاس پکڑے ہوئے تھے۔

"دادا جان آپ!" اسد نے ندامت سے کہا۔

"ہاں بیٹا! میری نصیحت تم پر اثر نہیں کرتی تھی۔ تکبر نے تمہاری عقل پر پردے ڈال رکھے تھے۔ یہ تمہارے غرور کی عبرت ناک سزا ہے۔ تم عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے ہو۔ ابراہیم ایک بازو سے محروم ہو گیا ہے۔ تمہاری نافرمانی اور غرور نے کتنی مصیبتوں کو جنم دیا ہے۔ ابراہیم کی بہن کی منگنی ملتوی ہو گئی ہے۔ اس کے والدین صدمے کی حالت میں ہیں۔ بیٹا! بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے۔ ہمیں عاجزی اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ زندگی اللہ کی دی ہوئی امانت ہے، ہمیں اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔"

اسد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دادا جان "المتکبر" کی تسبیح کرتے ہوئے یہ الفاظ دہرا رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ ہی عظمت اور بڑائی والا ہے۔ انسان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی کو حقیر جانے اور اپنی خوبیوں پر اترائے۔

☆☆☆

کیرتھر نیشنل پارک: آیئے ہم آپ کو اب کراچی سے صرف 70 کلو میٹر کے فاصلے پر ایک خوب صورت جگہ پر لے چلتے ہیں جہاں پہاڑ بھی ہیں، ریتلے میدان بھی، جنگل اور مختلف انواع کے جانور اور پرندے بھی ہیں۔ جی ہاں! یہ کیرتھر نیشنل پارک ہے۔ کیرتھر نیشنل پارک کا قیام 28 اکتوبر 1973ء کو عمل میں آیا۔ ہوا یوں کہ 1970ء کے عشرے میں ورلڈ وائلڈ لائف (W.W.F) کے جارج شیلر نے کیرتھر رینج میں اسٹڈی کے بعد اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو رپورٹ دی کہ اس علاقے میں بعض نایاب جانور موجود ہیں اگر انہیں بروقت تحفظ نہ دیا گیا تو ان کی نسل ختم ہو جائے گی۔ معاملے کی اہمیت کے پیش نظر اس پر سنجیدگی سے غور کیا گیا اور یوں 28 اکتوبر 1973ء کو اس پارک کا قیام عمل میں آیا۔ ورلڈ وائلڈ لائف کے قوانین کے تحت اس نیشنل پارک کو کیٹگری پانچ میں شمار کیا گیا۔ اس کیٹگری میں شمار ہونے والے نیشنل پارک میں جنگلی حیات کے تحفظ کا مکمل اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہاں ملک کا سربراہ بھی کسی جانور کا شکار نہیں کر سکتا۔ پارک کے قیام کے وقت اس میں 48 جنگلی بھیڑیں 12 سو کے قریب سندھ آئی بکس اور ایک سو چنکارا ہرن کے علاوہ کچھ تعداد میں چیتے بھی موجود تھے۔ سندھ وائلڈ لائف مینجمنٹ بورڈ حکومت پاکستان اور چند عالمی اداروں کے تعاون سے یہاں جنگلی حیات کے تحفظ کے خاطر خواہ انتظامات کیے گئے۔ آج یہاں 15 سو کے قریب چنکارا ہرن، 2 ہزار کے قریب جنگلی بھیڑیں اور تقریباً 4 ہزار کی تعداد میں سندھ آئی بکس موجود ہیں۔ ان تین کے علاوہ کیرتھر نیشنل پارک میں سیاہ گوش، صحرائی بلے، بھیڑیے، جنگلی چوہے، کانٹے دار چوہے، نیولے، چھپکلیوں، گرگٹ اور سانپوں کی کئی نایاب اقسام محفوظ اور قدرتی ماحول میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ پرندوں کی بھی مختلف اقسام یہاں موجود ہیں جب کہ چڑیا سے لے کر راج ہنس تک تقریباً 700 اقسام کے پرندے سائبیریا، یورپ اور دیگر ممالک سے سرد موسم میں ہجرت کر کے اس طرف آتے ہیں۔ سرد موسم میں ہمالیہ کا سنہرا عقاب اور گرے ہیوکولیس جیسا خوب صورت پرندہ بھی یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں گلدار (چیتے) بھی موجود تھے لیکن 1982ء میں آخری چار چیتے ایک حادثے کی نذر ہو گئے۔ کیرتھر نیشنل پارک میں انتظامی حوالوں اور جنگلی حیات پر تحقیق کرنے والوں کی سہولت کے پیش نظر دو سینٹر، کار سینٹر اور کرچار سینٹر موجود ہیں جب کہ دو سب سینٹر بھی ہیں۔ جنگلی حیات پر تحقیق کرنے والوں کو حتی الامکان سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ مطالعاتی دورے پر جانے کے لیے ان کے دفتر جو کہ کراچی پریس کلب اور وائی ایم سی اے (YMCA) کے قریب واقع ہے، سے پیشگی اجازت لینی پڑتی ہے۔ یہاں سیر و تفریح کے لیے بہترین وقت اکتوبر کے درمیان اور مارچ تک ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اکثر گرم رہتی ہے۔ ☆☆☆

انسانیت کی قدریں

انسانیت کی قدروں کا رکھنا خیال ہے
محشر میں ہم سے ہونا جو اس کا سوال ہے
رب کی عبادتوں ہی میں جینے کا ہے مزا
طاعت گزار حق ہی سدا لازوال ہے
پیارے نبیؐ سے جس نے لیا درس زیست کا
انسان دو جہان میں وہ باکمال ہے
دکھ درد میں انسان کے جو کام آئے گا
آسودہ، مطمئن ہاں اسی کا تو حال ہے
محنت سے جو نصیب ہو، عزت سے جو ملے
چٹنی سے بھی لذیذ وہی روٹی دال ہے
رہنا برائیوں سے سدا دور دور اب
ہر ایک برائی گویا کہ مچھلی کا جال ہے
خدمت میں جو بھی والدہ والد کی رہے گا
سنورا ہوا نصیب بھی دیکھ بھال ہے
ماں باپ کے قدموں کو جو چومے گا پیار سے
جنت کو اپنی پا کے وہی تو نہال ہے
علم و عمل، پڑھائی لکھائی ہو روز و شب
جنگوں میں بھی اے نقوی یہی اپنی ڈھال ہے

سید ذوالفقار حسین نقوی

☆...☆
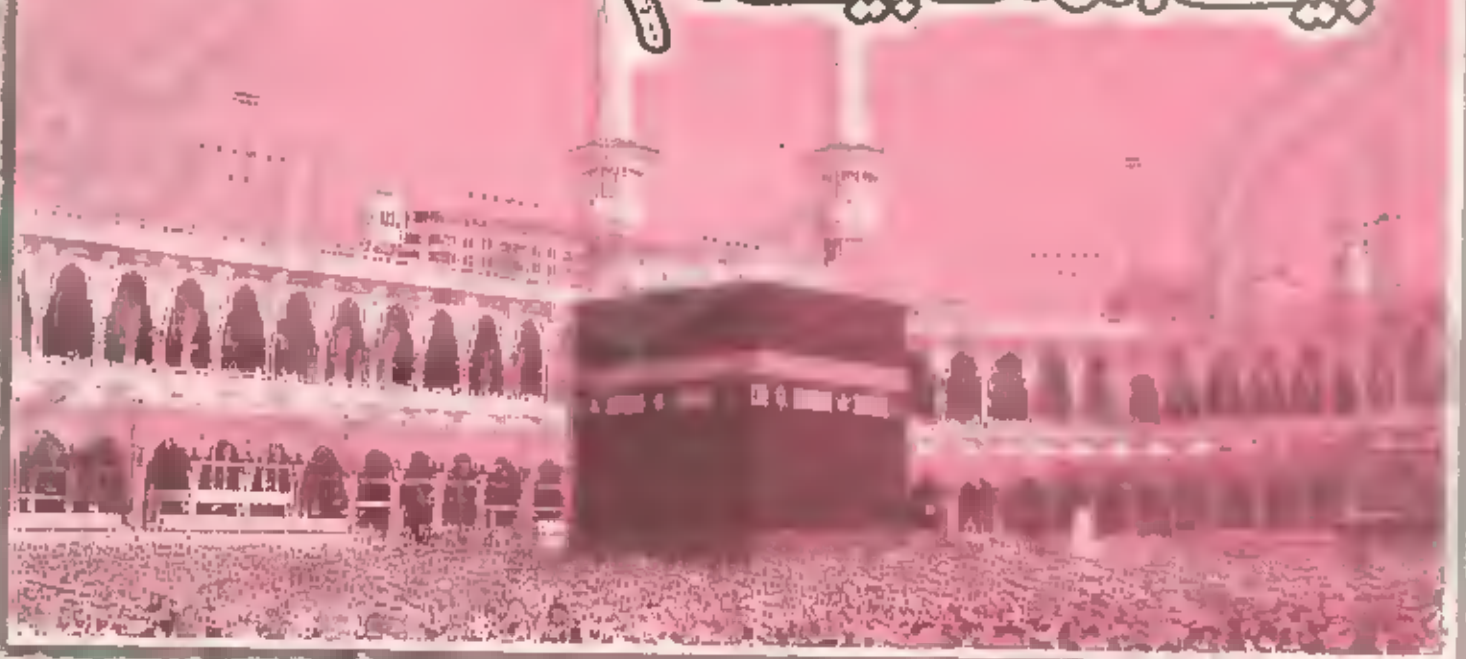
اَلْمُقْسِطُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(انصاف کرنے والا)

اَلْمُقْسِطُ جَلَّ جَلَالُہٗ اپنے بندوں کو انصاف دینے والے ہیں اور خود بھی بہت انصاف کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انصاف کو پسند فرماتے ہیں۔ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدالت کا ہی کام نہیں بلکہ ہم سب کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم سب کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں۔

کہاں کہاں......؟؟

1- اپنے جسم سے انصاف یہ ہے کہ صحت کا خیال رکھنا...... نہ کم کھانا اور نہ بہت زیادہ کھانا...... وقت پر سونا...... وقت پر کھیلنا......

2- بالوں سے انصاف یہ ہے کہ تیل لگانا اور کنگھی کرنا......

3- دانتوں سے انصاف یہ ہے کہ روزانہ اُٹھ کر ٹوتھ برش یا مسواک سے دانت صاف کرنا......

4- بہن بھائیوں کے لیے بھی چیز میں اُن کا حصہ رکھنا......

5- اسکول کے ہاف ٹائم میں اپنی باری پر کینٹین سے چیز لینا......

6- محلے اور گلی کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ اُسے صاف ستھرا رکھنا......

7- راستے کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ راستہ نہ روکیں...... سڑک پر کچرا نہ پھینکیں......

8- پڑوسیوں کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ پڑوسیوں کو ہم سے تکلیف نہ پہنچے...... جیسے شادی کے موقع پر رات دیر تک جاگنا...... بلند آواز سے باتیں کرنا...... اس شور سے پڑوسیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

9- رشتہ داروں سے انصاف یہ ہے کہ ان سے اچھے اخلاق سے پیش آنا اور جو ضرورت مند ہو اس کی مدد کرنا۔

10- ملک کے ساتھ انصاف یہ کہ اس کے قوانین کا احترام اور پابندی کرنا۔

یہ سب چیزیں بچپن ہی سے سیکھی جاتی ہیں۔ عقل مند لوگ کہتے ہیں کہ بچپن کی باتیں بچپن تک رہتی ہیں۔ یعنی جو عادت بچپن میں ہماری بن گئی بڑے ہو کر بھی وہی عادت رہتی ہے۔ اگر کسی نے ڈاکٹر بننا ہے تو بچپن ہی سے پڑھنا شروع کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے کھلاڑی بننا ہے تو بچپن ہی سے سیکھنا شروع کرے گا تو بڑا ہو کر صحیح کھیلے گا۔

ایک ٹافی

"سجاد! سب بچوں کو تین تین ٹافیاں دے دو۔"

سر عادل ایک ڈبا لے کے آئے تھے۔ ان کی بیٹی بیمار تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے صحت عطا فرمائی تو اس خوشی میں شکرانے کے طور پر وہ اپنی کلاس کے بچوں میں ٹافیاں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔

مانیٹر سجاد نے ٹافیاں لیں اور کلاس کے لڑکوں میں تین تین

نانیاں تقسیم کرنا شروع کر دیں۔ جب وہ تقسیم کرتے کرتے اپنے دو گہرے دوستوں ذکوان اور صفوان کے قریب پہنچا تو انہیں چپکے سے چار چار نانیاں دے دیں۔

"انہیں مجھے تین ہی چاہئیں۔" ذکوان نے ایک نانی واپس کر دی اور صفوان نے واپس نہ کی۔ سر عادل صاحب بھانپ گئے کہ سجاد نے انصاف سے کام نہیں لیا۔

ہاف ٹائم میں سر عادل نے ذکوان کو بلایا اور اس سے ساری معلومات لیں۔ تحقیق کرنے کے بعد انہوں نے صفوان اور سجاد کو بلایا۔

"سجاد بیٹا! ہر غلط کام کی بنیاد میں چھوٹی چھوٹی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ایک نانی کی غلط تقسیم ناانصافی کا پہلا زینہ ہے۔"

ان شاء اللہ تعالیٰ آج کا سجاد کل کا قاضی بن سکتا ہے اور پھر ایک واقعہ سنایا: "ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک رشتہ دار آیا، اس نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ مجھے بیت المال میں سے کچھ دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ڈانٹتے ہوئے فرمایا: "تمہارا ارادہ ہے کہ میں اللہ کے سامنے خیانت کرنے والے حکمران کی حیثیت سے پیش ہوں۔" اور اسے کچھ نہ دیا۔

اس انصاف کا اثر تھا کہ دشمنوں کے دلوں میں ان کا رعب اور عظمت تھی۔ ایک مرتبہ کسریٰ کا خاص مشیر "ہرمزان"، امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے ہیرے جواہرات لگا ہوا سونے کا تاج پہن رکھا تھا۔ ریشم کا لباس پہنے ہوئے مدینہ میں داخل ہوا اور پوچھنے لگا: "خلیفہ کا محل کہاں ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ یہاں محلات نہیں ہوتے۔ اس نے پوچھا: "پھر بتاؤ کہ خلیفہ رہتا کہاں ہے؟" لوگوں نے مٹی کے ایک گھروندے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ خلیفہ کی رہائش گاہ ہے۔ اس نے بڑے تعجب سے ادھر ادھر دیکھا کہ محافظ کہاں ہیں؟ لوگوں نے وضاحت کی کہ خلیفہ کے لیے کوئی حفاظتی دستہ مقرر نہیں۔

ہرمزان نے دروازے پر دستک دی۔ سیدنا عمرؓ کا بیٹا باہر آیا۔ ہرمزان نے پوچھا: "خلیفہ کہاں ہیں؟" بیٹے نے جواب دیا: "انہیں مسجد میں یا مدینہ میں کسی جگہ تلاش کرنا ہوگا۔" انہوں نے مسجد میں دیکھا، آپ نہیں ملے۔ وہ لوگ آپ کو تلاش کرتے کرتے ایک درخت کے پاس پہنچے، جس کے نیچے سیدنا عمرؓ اپنے بازو کا تکیہ بنائے، اپنی پیوند لگی چادر اوڑھے بڑے آرام سے گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کا کوڑا ایک جانب پڑا تھا۔ ہرمزان سوچنے لگا: "کیا یہی عمر بن خطاب ہیں، سب سے بڑے فاتح؟ کیا یہی شخص ہیں جن کا نام سن کر بڑے بڑے بادشاہوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے؟ یہ شخص بے فکری سے ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔" یہ کیفیت دیکھ کر ہرمزان پر خوف طاری ہو گیا۔

اس نے ایک جملہ کہا جو تاریخ کا حصہ بن گیا: "خلیفۃ المسلمین! آپ نے عدل و انصاف کیا، اسی لیے آپ کو کوئی خوف نہیں۔" سجاد اور صفوان ایک نانی پر بھٹکنے کی وجہ سے بہت شرمندہ تھے۔

"اگر آج تم ایک نانی پر بھٹکنے سے بچ گئے تو کل ایک پلاٹ، ایک کوٹھی، ایک کار، ایک لاکھ پر بکنے سے بچ جاؤ گے۔ آج کا فیصلہ کل کے فیصلے کے ساتھ ہے۔ جو انصاف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے۔" انہیں اپنی غلطی کا بھرپور احساس تھا۔

آئندہ ہر حال میں وہ انصاف کرنے کے عزم کے ساتھ اٹھے۔ وہ اسٹاف روم سے جانے لگے تو سر عادل نے دعا کی یا اللہ! ان بچوں کو اس پر استقامت عطا فرما۔

نہ بھولیے گا!

جہاں کہیں ہوں، جس جگہ ہوں۔ انصاف پر قائم رہنے کے لیے ایک پیاری دعا مانگنا نہ بھولیے گا۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ الْقَصْدَ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنٰی۔"

ترجمہ: "اے اللہ! میں مال داری اور غریبی ہر حال میں آپ سے میانہ روی اور عدل کا سوال کرتا ہوں۔"

یاد رکھنے کی باتیں:

1- اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ انصاف والا ہے۔ اس لیے جو حال بھی ہو اس پر خوش رہے۔ اگر غربت ہے تو اس پر راضی رہے۔ ہاں غربت دور ہونے کی دعا اور کوشش کرتا رہے۔ مال و دولت کی نعمت ہے تو اس پر تکبر نہ کرے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے کا یقین رکھے۔

2- ہمیں بھی ہر حال میں انصاف والا کام کرنا چاہیے۔ کلاس اور اسکول کی صفائی کا خیال رکھ کر انصاف کرنا..... محترم اساتذہ صاحب کا ادب کر کے انصاف کرنا..... والدین کا کہا مان کر انصاف کرنا..... اپنی صحت کا خیال رکھ کر انصاف کرنا..... بہن بھائیوں کا خیال رکھ کر انصاف کرنا۔

☆☆☆

وہ اپنی اس زندگی سے بہت بے زار تھا۔ تنگ دستی اور مفلسی نے ان کے گھر میں ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ پانچ بہن بھائیوں کی غذا، کپڑوں اور پڑھائی کے علاوہ بہت سے اخراجات تھے، جو اس کے والد کو قلیل تنخواہ میں کرنے پڑتے تھے۔ عدنان احمد پڑھائی کے ساتھ ساتھ شام کو ایک جنرل اسٹور پر سیلز مین تھا۔

رفتہ رفتہ سب بہن بھائی بڑے ہو گئے۔ عدنان سب سے بڑا بیٹا تھا اور نہایت سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ ماں باپ کے لیے عدنان واحد سہارا تھا جو ان کے مالی بوجھ کو اٹھا رہا تھا۔ عدنان نے بڑی کوششوں کے بعد پائی پائی اکٹھی کی اور دبئی جانے کا ارادہ کیا۔ قسمت نے ساتھ دیا اور وہ دبئی پرواز کر گیا۔

نئے ملک میں محنت مزدوری کر کے اس نے کافی پیسہ کما لیا تھا۔ بہنوں کی شادیاں کیں اور بھائیوں کو پڑھایا لکھایا۔

یوں تو عدنان اچھی فطرت کا تھا لیکن جب اس کے ہاتھ میں پیسہ آنے لگا تو اس میں اتراہٹ پیدا ہو گئی۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ روپے کی ریل پیل سے احساسِ کمتری کی جگہ احساسِ برتری پیدا ہو گیا تھا۔ مزید پیسہ کمانے کی دھن اس پر سوار ہو گئی۔

''بیٹا! اب پاکستان آ جاؤ۔ اب شادی کر کے اپنا گھر بسا لو۔'' والد اور والدہ نے اصرار کیا۔

''ابا جان ابھی وقت نہیں آیا۔'' عدنان نے جواب دیا۔

''کب تک تم کماتے رہو گے۔ بس ہم نے تمہارے لیے لڑکی دیکھ رکھی ہے۔ آ جاؤ اب۔'' ابا جان نے اسے مجبور کیا۔

کچھ عرصے کے بعد عدنان پاکستان آیا تو اسے والدین کی پسند کی ہوئی لڑکی اچھی نہیں لگی۔ یہ لڑکی پڑھی لکھی اور دین دار تھی۔ بس مالی لحاظ سے یہ لوگ اچھے نہ تھے۔ اس کے والد کو بہت افسوس ہوا۔ خیر بیٹے کی مرضی کے مطابق دولت مند لڑکی سے اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد وہ واپس دبئی چلا گیا۔ گھر والوں کے اصرار پر عدنان کو پاکستان آنا پڑا۔ یہاں کاروبار کو جمانے میں کافی عرصہ لگ گیا۔ اللہ نے اسے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ بچے بڑے ہوتے گئے۔ اس کا بڑا بیٹا اب دوم جماعت میں تھا۔ نہایت شرارتی اور ضدی بچہ تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ عدنان کے مالی حالات کمزور ہوتے گئے۔ ناچار اسے دوبارہ دبئی جانا پڑا۔

''بیٹا مستقل پاکستان آنے کی کوشش کرو۔ تمہارے بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی تربیت میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ ہماری بہو تمہاری پسند ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہو گا کہ دولت سے سیرت کی

خوبیاں نہیں خریدی جا سکتیں۔'' ابا جان نے عدنان کو سمجھایا۔

عدنان کا دل ویسے بھی پاکستان میں نہیں لگتا تھا۔ وہ تنہائی کا عادی ہو گیا تھا۔ اپنے بچوں کی طرف سے وہ لاپروائی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اب وہ پھر دبئی سدھار گیا۔

اس کا بڑا بیٹا نویں جماعت میں تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں عدنان پاکستان آیا۔ یہاں آ کر اسے شدید جھٹکا لگا جب اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا بہت بگڑ چکا تھا۔ روز روز کی شکایات سے وہ سخت عاجز تھا۔ اس کی بیوی نے بچوں کی تربیت پر توجہ نہ دی تھی، لہٰذا بچے اب بے قابو ہو چکے تھے۔ بُرائی جڑ پکڑ لے تو اس کا خاتمہ مشکل ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو کوستے اور مورد الزام ٹھہراتے۔ گھر کا ماحول خاصا بوجھل ہو گیا تھا۔

ایک دن ابا جان لان میں پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ عدنان ان کے پاس آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ ابا جان نے جب حال احوال پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اپنے بچوں کی طرف سے فکرمند ہے۔ ابا جان بغور سن رہے تھے۔

''مالی نے سارے لان کا ستیاناس کر دیا ہے۔'' ابا جان بڑبڑائے۔

''عدنان یہ دیکھو۔ مالی کی لاپروائی کی وجہ سے سارے پھول کملا گئے ہیں۔ اکثر پودے پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ گئے ہیں۔ اسی طرح بچوں کی تربیت نہ کی جائے تو وہ بھی سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہے جو پھلتا پھولتا نہیں۔ ایسے شجر کی مانند ہوتا ہے جو کسی کو سایہ نہیں دے سکتا۔ ایسے پھولوں کی مانند ہوتا ہے جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتے ہیں۔ تمہاری پریشانی بجا ہے۔ یہ سراسر تمہارا قصور ہے۔ تمہاری غیر موجودگی اور تمہاری بیوی کی تربیت نے تمہارے بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔ تم نے دولت کو تعلیم اور سیرت پر ترجیح دی۔

تم کیسے اُمید رکھتے ہو کہ تمہاری اولاد فرماں بردار ہو اور سکھ دے۔ کیا تم نے اپنے بچوں کی آبیاری کی جیسے پودوں کی کی جاتی ہے؟''

عدنان بہت پچھتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ یہ گھر اس کا چمن تھا جس میں پھول مرجھائے ہوئے تھے۔ شجر بے سایہ تھے، چمن کے یہ پھول اور پودے اس کے بچے تھے، جن کی اس نے آبیاری نہ کی تھی۔

''بیٹا پریشان مت ہو۔ اب بھی وقت ہے۔'' ابا جان نے پودوں کی گوڈی کی اور پانی دینا شروع کر دیا۔

''اب دیکھو پانی دینے سے پھول تازہ دم ہو گئے ہیں۔ جاؤ اپنے بچوں کی آبیاری کرو۔ وقت ضائع مت کرو۔ والدین بچوں کے لیے مالی کی طرح ہوتے ہیں۔ پھولوں اور پودوں کی طرح اس کی کانٹ چھانٹ کرتے ہیں، پانی دیتے ہیں۔ اچھی تعلیم و تربیت ہی بچوں کی آبیاری ہے۔'' عدنان فوراً اُٹھا اور اندر کی طرف بھاگا تا کہ مزید دیر نہ ہو جائے۔ ☆☆☆

ھنگول ...... قومی بوستان: ہنگول نیشنل پارک بلوچستان اور پاکستان کا سب سے بڑا نیشنل پارک ہے جو 19 ہزار 44 ہیکٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ کراچی سے 190 کلو میٹر دور یہ پارک بلوچستان کے تین اضلاع گوادر، لسبیلہ اور آواران کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس علاقہ میں بہنے والے دریائے ہنگول کی وجہ سے اس کا نام ہنگول نیشنل پارک رکھا گیا ہے۔ اس علاقہ کو 1988ء میں نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا ہے۔ ہنگول نیشنل پارک اس وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں چار مختلف قسم کے ماحولیاتی نظام (Eco System) کا پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا ہنگلاج مندر بھی اس پارک میں واقع ہے۔ بیس افراد کا عملہ جو گیم واچر، رینجرز اور مینیجر پر مشتمل ہے، اس پارک کی نگرانی کرتا ہے۔ اس پارک کو چلانے کے لیے تین حصوں میں میرین رینج اور ان لینڈ رینج میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ پارک طبعی طور پر پہاڑ، ریت کے ٹیلوں اور دریا کے ساتھ سیلابی میدان وغیرہ میں بنا ہوا ہے۔ ہنگول ندی نیشنل پارک سے ہو کر گزرتی ہے اور سمندر میں گرنے سے پہلے ایک مدوجزر والا دہانہ بناتی ہے جو کہ ہجرت کرنے والے آبی پرندوں اور دلدلی مگرمچھوں کا مسکن ہے۔ اس پارک کے جنگلی حیات میں مگرمچھ، لمبی چھپکلی، موٹی زبان والی چھپکلی، وائپر، کوبرا ناگ وغیرہ کے علاوہ سمندری حیوانات بھی شامل ہیں۔ نباتات میں تمریکس اور کیکر موجود ہیں۔ یہاں چند نایاب جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کی طبی حوالے سے بہت اہمیت ہے۔ مقامی لوگ اس کے ذریعے کئی بیماریوں کا علاج دیسی طریقے سے کرتے ہیں۔ ☆☆

ایک عورت (اپنے خاوند سے): "آپ مجھے رانی کیوں کہتے ہیں؟"
خاوند: "کیوں کہ نوکرانی کہنا تھوڑا لمبا ہو جاتا ہے۔"
بیوی: "آپ کو پتا ہے کہ میں آپ کو جان کیوں کہتی ہوں؟"
خاوند: "کیوں؟"
بیوی: "کیوں کہ جانور کہنا تھوڑا لمبا لگتا ہے۔" ☆

ایک دوست (دوسرے سے): "اگر دنیا میں پانی ختم ہو جائے تو......؟"
دوسرا دوست: "دودھ تو خالص ملے گا۔" (سویرا کامران، لاہور)

ایک خاتون نے فلیٹ سے نکلتے وقت دروازہ لاک کر دیا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ چابی تو وہ اندر ہی بھول گئی ہیں۔ ایک پڑوسن نے انہیں پریشان دیکھ کر کہا: "تم لوگ ایک فالتو چابی کیوں نہیں بنوا لیتے، اسے فلیٹ کے باہر گملے میں چھپا دیا کرو۔"
خاتون نے کہا: "وہ تو ہم نے بنوائی ہوئی ہے اور اسے گملے میں ہی چھپاتے ہیں۔"
"تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟" پڑوسن نے حیرت سے پوچھا۔
"کل اس گملے کو دھوپ سے بچانے کے لیے میرے شوہر نے اندر رکھ دیا تھا۔" خاتون نے جواب دیا۔ (عظیمہ زہرہ، لاہور)

ایک پرلے درجے کے ست الوجود شخص نے اپنے دوست سے کہا:
"بھائی میری تو قدرت نے ہمیشہ مدد کی ہے۔"
"کیسے؟" دوست نے پوچھا۔
ست الوجود شخص بولا: "میں نے کچھ درخت گرانے کا پروگرام بنایا تھا کہ طوفان آ گیا اور کچھ درخت گر گئے۔ اس کے بعد میں نے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کو جلانا تھا کہ آسمانی بجلی کڑکی اور کوڑا کرکٹ خود بخود جل کر راکھ ہو گیا۔"
"اب کیا پروگرام ہے؟" دوست نے ست الوجود شخص سے پوچھا۔
"میرا پروگرام زمین سے آلو اور گاجریں نکالنے کا ہے اور میں اس کام کے لیے زلزلے کا انتظار کر رہا ہوں۔" (احور کامران، لاہور)

احمد: "یار انڈے اور ڈنڈے کا فرق بتاؤ!"
عمار: "بھئی انڈا پیٹ کے اندر جا کر جسم کو گرم کرتا ہے جب کہ ڈنڈا باہر ہی سے گرم کر دیتا ہے۔" ☆

اُستاد (شاگرد سے): "چند مشہور لڑائیوں کا حال بتاؤ؟"
شاگرد: "جناب! امی جان کا کہنا ہے کہ گھر کی باتیں باہر مت بتایا کرو۔" ☆

اُستاد (شاگرد سے): "اللہ تعالیٰ نے آنکھیں کیوں بنائی ہیں؟"
شاگرد: "جناب! دیکھنے کے لیے۔"
اُستاد: "شاباش! اور کان؟"
شاگرد: "جناب! مرغا بننے کے لیے۔" (خدیجہ نعیم، لاہور)

شمشاد (جاوید سے): "طبیعت کیسی ہے؟"
جاوید: "اب تک تو درست تھی مگر اب خراب ہونے لگی ہے۔"
شمشاد: "کیا مطلب؟"
جاوید: "ڈاکٹر بل لینے کے لیے آ رہا ہے۔" ☆

باپ: "بیٹا! سردیوں میں بارش کیوں نہیں برستی؟"
بیٹا: "ابا جان! اس لیے نہیں برستی کہ اسے سردی لگتی ہے۔" ☆

لڑکا: "مصور صاحب! کل نمائش میں مَیں آپ کی ہی تصویر دیکھتا رہا۔"
مصور: "شکریہ!"
لڑکا: "بات یہ تھی کہ دوسرے مصوروں کی تصویروں پر بھیڑ بہت تھی۔"

☆

کچہری کا چپڑاسی: "آپ سفارش علی یا رشوت حسین کو جانتے ہیں؟"
زمین دار: "نہیں! وہ کون ہیں؟"
چپڑاسی: "تو پھر کچہری میں کون سنے گا۔" (آصف منیب، پشاور)

اُستاد (زبیر سے): "اخبار پڑھنے کا کیا فائدہ ہے؟"
زبیر: "گھر میں ردی جمع ہو جاتی ہے اور ہم اسے بیچ کر قلفیاں کھاتے ہیں۔" (اسامہ فیصل، گجرات)

ماں نے بیٹے سے کہا: "دیکھو بیٹا! اگر تم آج خاموشی سے اسکول چلے جاؤ اور دن بھر کوئی شرارت نہیں کرو گے تو میں تمہیں شام کو دو روپے کا بالکل نیا چمکتا سکہ دوں گی۔"
بیٹے نے معصومیت سے کہا: "نیا اور چمکتا ہوا سکہ آپ اپنے پاس رکھیے مجھے تو بس ایک میلا نوٹ دے دیں، 10 روپے کا۔"
(نامرہ زہرہ، کوئٹہ)

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ سنت کا لفظی مطلب کیا ہے؟

i۔ راہ نمائی   ii۔ راستہ   iii۔ نیکی

2۔ قلمی شور: کسے کہتے ہیں؟

i۔ سلفیورک ایسڈ   ii۔ پوٹاشیم نائٹریٹ   iii۔ کاربولک ایسڈ

3۔ پاکستان کا قومی ترانہ حفیظ جالندھری کے کس مجموعہ کلام میں ہے؟

i۔ شب تار   ii۔ شاہنامہ اسلام   iii۔ چراغ سحر

4۔ مشہور پاکستانی خطاط صادقین کا اصل نام کیا ہے؟

i۔ احمد نقوی   ii۔ علی نقوی   iii۔ سید نقوی

5۔ شاہراہ ریشم کا نیا نام کیا رکھا گیا ہے؟

i۔ شاہراہ قراقرم   ii۔ فرینڈ شپ ہائی وے   iii۔ پاک چائنہ موٹروے

6۔ دنیا کی سب سے بڑی جھیل کون سی ہے؟

i۔ کیسپین (روس)   ii۔ بیکال (روس)   iii۔ نیاگرا

7۔ سیاہ جھنڈا کس چیز کی علامت ہے؟

i۔ امن   ii۔ جنگ   iii۔ صلح

8۔ اولمپک گیمز کتنے سالوں بعد منعقد کی جاتی ہیں؟

i۔ ہر 5 سال   ii۔ 4 سال بعد   iii۔ 6 سال بعد

9۔ یہ شعر بانگ درا سے لیا گیا ہے، مکمل کیجیے۔

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں ....

10۔ پاکستان کا سب سے پہلا بنک کون سا ہے؟

i۔ نیشنل بنک   ii۔ حبیب بنک   iii۔ الائیڈ بنک

جوابات علمی آزمائش جنوری 2016ء

1- 62 سال 2- انڈونیشیا 3- مکہ المکرمہ 4- کاربن 5- انٹارکٹیکا
6- موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں 7- لوہا 8- 1952ء 9- 54
درجے پر 10- مری

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جارہے ہیں۔

☆ مرزا حمزہ بیگ، حیدرآباد (150 روپے کی کتب)
☆ سعیہ وجیہہ ضیغم، پشاور (100 روپے کی کتب)
☆ زینب آصف، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی:

عادل عاصم، منڈی بہاؤ الدین۔ محمد سعد، لاہور۔ حدیقہ عارف، لاہور۔ سائرہ سکندر، کراچی۔ عدن سجاد، جھنگ۔ علینا اختر، کراچی۔ مریم ارشد، زینب ارشد، عائشہ امجد، سرگودھا۔ مریم جاوید، مظفر آباد۔ تیمور ذوالفقار، دالبن۔ اسامہ بن طاہر، منڈی بہاؤ الدین۔ احمد نواز، سمندری۔ نور الایمان، فیصل آباد۔ وقاص احمد قادری، لالہ موسیٰ۔ ملک محمد احسن، راولپنڈی۔ نجم السحر، منڈی بہاؤ الدین۔ فرحان سعید احمد، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاولپور۔ وجیہہ خلیل، گوجرانوالہ۔ منزنامہ اصغر، لاہور۔ مریم سید، عائشہ سید، پشاور۔ حبیبہ مجید، لاہور۔ محمد وقاص، جھنگ صدر۔ عبدالرحمن عطاری، ساہیوال۔ محمد زبیر ارشد، لاہور۔ عروسہ خالد، اٹک۔ عائشہ نذیر، کراچی۔ اعیان جاوید، حیدرآباد۔ امتیاز عالم، واہ کینٹ۔ عثمان حیدر، پشاور۔ لائبہ بشیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ محمد سلیمان بٹ، ساہیوال۔ عبدالغفور حیدری، کراچی۔ ندیم بیگ، نوشہرہ۔ نورین اشفاق، رحیم یار خان۔ مریم نواز، فیصل آباد۔ جلال عابد بٹ، دینہ۔ بشریٰ جبل، رسالپور۔ گل ہما، حیدرآباد۔ نور الامین، اسلام آباد۔ سجاد حیدر، کراچی۔ مسعود الحسن، خانیوال۔ ثوبیہ سلیم، لاہور۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ محمد ارشاد، بہاولپور۔ ذوہیب احمد، ملتان۔ احسن آفاق، اسلام آباد۔ آسفہ ممتاز، جھنگ۔ وقار یونس، بورے والا۔ مریم عبداللہ، پشاور۔ عبداللہ نعیم، چنیوٹ۔ نگہت سلیم، گجرات۔ اظہر عباس، پشاور۔ وقار صادق، راولپنڈی۔ محمد جواد، بہاول نگر۔ معوذ الحسن، خانیوال۔ اخلاق احمد، اوکاڑہ۔ زوہیہ طارق، اسلام آباد۔ عائشہ نور، دہاڑی۔ آصف نواز، واہ کینٹ۔ فائزہ حنیف، گجرات۔ ہارون رشید، اوکاڑہ۔ رضوان بشیر، لاہور۔ منائل نواز، کلورکوٹ۔ عدن بشیر، ساہیوال۔ طلحہ وسیم، اوکاڑہ۔ قمر سلیم، وزیر آباد۔ حسن رضا عابدی، کاموکی۔ عمر فاروق، گوجرانوالہ۔ محمد ارسلان خان، ذرہ اسماعیل خان۔ سمعیہ توقیر، اٹک۔ عمر فاروق، گوجرانوالہ۔ بینش آفاق، کراچی۔ ماروشہ عزیز، لاہور۔ عبدالمقیت، فیصل آباد۔ صدام صادق، راولپنڈی۔ ادریس بابر، خانیوال۔ محمد سلیم چشتی، لیہ۔

جامع دعا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ جامع دعاؤں کو پسند فرماتے تھے۔ جامع دعا کا مطلب ہے الفاظ تھوڑے ہوں اور مفہوم بہت وسیع۔ اس لیے اپنے الفاظ میں دعا کرنے کے بجائے زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ مسنون الفاظ میں دعائیں کی جائیں، اس لیے کہ ایک تو وہ نہایت جامع ہیں اور دوسرے رسالت مآبؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں جو تاثیر اور برکت کے لحاظ سے بے مثال ہیں۔

(ثمین، ساہی وال)

تعلیم و تربیت

☆ تعلیم کیا ہے؟ کیا کتابی علم؟ ہرگز نہیں! دُنیا، انسان اور اس کے اعمال کی یگانگت کا نام ہی تعلیم ہے۔ (برک)

☆ مٹی، پانی اور روشنی ان کے ساتھ پوری وابستگی رکھے بغیر جسم کی تعلیم و تربیت نہیں ہوتی۔ (ٹیگور)

☆ تعلیم کا مقصد انسانی علم میں اضافہ کرنا ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد انسانی ذہن کی تشکیل ہے۔ (ڈاڈیٹ)

☆ تعلیم زندگی کے مختلف حالات کو نبھانے کی خوبی کا نام ہے۔ (جان ڈی ہون)

☆ تعلیم انسان کی روح کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو سنگِ مرمر کے ٹکڑے کے لیے فنِ سنگ تراشی۔ (ایڈیسن)

☆ دُنیا میں جتنے قسم کے حصول ہیں، تعلیم ان سب سے بڑھ کر ہے۔ (کوی نرالا)

☆ ایک مرد کو تعلیم دے کر آپ صرف ایک فرد کو تعلیم دیتے ہیں۔ ایک عورت کو تعلیم دے کر آپ ایک کنبہ کو تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔ (میکلور)

(محمد امجد کامران، لاہور)

ابلیس کی فریاد

اللہ سے کی رد کے یہ ابلیس نے فریاد
اس وقت جو موجود ہے آدم کی کچھ اولاد
اس کو تو وہ گر یاد ہیں مجھ کو بھی نہیں یاد
اُستاد ملائک تھا یہ میرا بھی ہے اُستاد
ابلیس کا ہر کام تو انسان نے سنبھالا
میرے لیے کیا حکم ہے اللہ تعالیٰ

(سید ضمیر جعفری) (ضحویٰ، کبیر وال)

سنہری اقوال

1- سب سے بڑی فتح خود کو فتح کرنا ہے۔
2- بردباری، عقل کا اور سچائی، بزرگی کا کمال ہے۔
3- بردباری صلح پسندی کا ذریعہ ہے۔
4- حسد کرنے والے کے لیے صرف یہی سزا کافی ہے۔
5- آزادی کی کوئی قیمت نہیں۔

(احور کامران رانا، لاہور)

سنہری باتیں

☆ شکست کھانا بُری بات نہیں، شکست کھا کر ہار مان جانا بُری بات ہے۔

☆ جو دُکھ دے اسے چھوڑ دو مگر جسے چھوڑ دو، اسے دُکھ نہ دو۔

☆ دن کی روشنی میں رزق تلاش کرو اور رات میں اسے تلاش کرو جو رزق دیتا ہے۔

☆ آسمان پر نگاہ ضرور رکھو مگر یہ مت بھولو کہ پاؤں زمین پر ہی رکھے جاتے ہیں۔

☆ اچھے عمل سے کسی کو دی خوشی ہزار سجدے کرنے سے بہتر ہے۔

☆ سو دوستوں سے بہتر وہ ایک دشمن ہے جو دل میں نفرت تو رکھتا ہے مگر منافقت نہیں کرتا۔

☆ سچی محبت ایک نایاب شے ہے لیکن سچی دوستی اس سے بھی نایاب ہے۔

☆ حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

☆ جو لوگ درد کو محسوس کرتے ہیں، وہ کبھی دوسروں کے لیے درد کی وجہ نہیں بنتے۔

☆ انسان اپنی زندگی میں پیچھے تب رہ جاتا ہے، جب وہ دوسروں سے زیادہ اپنے آپ کو اہمیت دینے لگتا ہے۔

(فائزہ رزاق، خانیوال)

ماں

☆ آسمان نے کہا صبح کی پہلی کرن ہے۔
☆ چاند نے بتایا آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
☆ ستاروں نے سرگوشی کی ماں ایک روشن ستارہ ہے۔
☆ سورج نے برملا کہا ماں کی گود جیسی گرمائش مجھ میں نہیں ہے۔
☆ بادل نے خیال ظاہر کیا ساون کے پہلے قطرے کی مانند ہے۔
☆ موسم نے انکشاف کیا ماں پیار کی صبح ہے۔
☆ سمندر نے راز بتایا ماں ایک کنارا ہے۔
☆ پھول نے جھوم کر کہا ماں ایک خوب صورت خوش بو ہے۔
☆ درخت نے لہرا کر بتایا ماں وہ چھاؤں ہے جس کے سائے میں بیٹھ کر سکون ملتا ہے۔ (عمران ایوبی، ہارون اشرف، دانیہ جنگ)

خوب صورتی کے بہترین راز

☆ ہاتھوں کی خوب صورتی کے لیے اپنے ہاتھوں سے صدقہ دیں۔
☆ آواز کی خوب صورتی کے لیے قرآن پاک کی تلاوت کریں۔
☆ آنکھوں کی خوب صورتی کے لیے اللہ کے خوف سے آنسو بہائیں۔
☆ چہرے کی خوب صورتی کے لیے وضو کی عادت ڈالیں۔
☆ دل کی خوب صورتی کے لیے اپنے دل میں اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کریں۔ (حرا ارشد، سارا ارشد، عائشہ امجد، سرگودھا)

کتاب دوستی

دوستی ایک بہت اچھا ذریعہ ہے، اپنے دکھ درد بانٹنے کا۔ ہر کسی کو اپنے دوستوں پر بہت مان ہوتا ہے۔ میری بھی بہت دوست ہیں اور میرے لیے وہ سب قابلِ احترام ہیں، مگر میری ایک دوست ایسی بھی ہے جو ان سب سے زیادہ قابلِ احترام اور قابلِ عزت ہے اور وہ کوئی اور نہیں میری پیاری کتابیں ہیں۔ میں اپنی اس دوست کے ساتھ خوب باتیں کرتی ہوں اور یہ میری تنہائی کی بھی بہت اچھی ساتھی ہے۔ دوستو! آپ کو بھی میں یہی نصیحت کروں گی کہ اپنی کتاب جیسی دوست سے کبھی منہ نہ موڑنا۔ میری دوست، کتاب، دوستی زندہ باد۔ (ثروت یعقوب، لاہور)

اقوال زریں

☆ انسان تین چیزوں سے مکمل ہوتا ہے۔ اول خوف، دوم امید، سوم محبت۔ خوفِ خدا کی وجہ سے انسان گناہوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی امید انسان کو اطاعت پر مجبور کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس کی رضا کو ترجیح دی جاتی ہے۔
☆ عزت اور حشمت انصاف میں سمجھو۔
☆ جو شخص تمام دنیا کو دشمن بنانا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ تکبر اختیار کرے۔
☆ اچھائی کے لیے ہمیشہ بہانے کی تلاش میں رہو۔
☆ اپنی سرگرمیوں کو لوگوں کی سرد کلامی کی وجہ سے ترک نہ کرو۔
☆ جذباتِ حق میں سے ایک جذبہ دونوں جہانوں کی عبادت سے بہتر ہے۔
☆ جیسے تم ہو ویسے ہی نظر آؤ، ورنہ اصلیت خود بخود ظاہر ہو گی۔
☆ گناہ پر کبھی فخر نہ کرو۔
☆ اپنے نیک و بد کو پوشیدہ رکھو۔
☆ خودی کی تکمیل اس عبادت سے ہوتی ہے جس میں ظاہر و باطن دونوں سجدہ ریز ہوں۔ (محمد ریحان المصطفیٰ، فیصل آباد)

ہیرے جواہرات

☆ اگر تم زندگی کے سفر میں کام یاب رہنا چاہتے ہو تو اپنے غم پی لو۔
☆ انسان سے محبت کرنا خدا سے محبت کرنا ہے۔
☆ اپنے آپ پر اعتماد کرنے والے فتح حاصل کرتے ہیں۔
☆ جذباتی لوگ نہ تو خود خوش رہتے ہیں اور نہ دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔
☆ عالم کی صحبت میں بیٹھنا سالہا سال کی عبادت سے بہتر ہے۔
☆ جس طرح چاند کے بغیر رات ادھوری ہے اسی طرح علم کے بغیر ذہن ادھورا ہے۔
☆ غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھو کیوں کہ عقل مند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔ (محمد جعفر، گرو ٹ)

لفظوں کی گہرائیاں

☆ اس خوشی سے دور رہو جو کل غم کا کانٹا بن کر دکھ دے۔
☆ انسان کے لیے بہترین مطالعہ انسانوں کے دلوں کا مطالعہ ہے۔
☆ انکساری کا راستہ اختیار کرو ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے۔
☆ جس نے اپنے آپ کو پسند کیا وہ برباد ہو گیا۔
☆ تجربہ مفت ملنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے وقت اور عمر گنوانی پڑتی ہے۔ (حبہ رحمان، اکوڑہ خٹک)

اسکاؤٹنگ کا عالمی دن

رانا محمد شاہد

اسکولوں و کالجوں میں مخصوص یونی فارم میں ملبوس آپ نے ایسے بچے اور نوجوان دیکھے ہوں گے جو اسکاؤٹ کہلاتے ہیں۔ ان بچوں کی ہر جگہ عزت کی جاتی ہے۔ ہر سال 22 فروری کو اسکاؤٹنگ کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اسکاؤٹ کی تحریک بنیادی طور پر کیا ہے؟ اس مضمون میں ہم اسی بات کا جائزہ لیں گے۔

اسکاؤٹ کے معنی عام طور پر جہاز، برق رفتار اور پیغام رساں کے لیے جاتے ہیں۔ یہ دو الفاظ سے مل کر بنا ہے، اسکاؤٹنگ یعنی ''سائنٹفک آؤٹنگ۔'' اسکاؤٹ تحریک کا آغاز 1907ء میں انگلستان کے جزیرے ''براؤن سی'' میں 20 لڑکوں کے ایک کیمپ سے ہوا۔ تحریک کے بانی سر رابرٹ اسٹیفن اسمتھ لارڈ بیڈن پاؤل تھے۔ رابرٹ اسٹیفن لارڈ بیڈن پاؤل برطانیہ کے شہر لندن میں 22 فروری 1857ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے یوم پیدائش کے حوالے سے ہی ہر سال 22 فروری کو اسکاؤٹنگ کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ لارڈ بیڈن پاؤل نے ملکی ضروریات کے پیش نظر اسکاؤٹ تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس تحریک کا تصور لارڈ بیڈن پاؤل کے ذہن میں 1899ء میں آیا، جب ''میف کنگ'' نامی ایک قصبہ زولو قبیلے کے محاصرے میں آیا۔ ''میف کنگ'' جنوبی افریقہ کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لارڈ نے اس قصبے کی حفاظت کے لیے مختلف جگہوں پر فوج کو تعینات کیا جن میں سات سو کے قریب پولیس اہل کار اور دوسرے تربیت یافتہ رضاکار موجود تھے۔ مزید افراد کی ضرورت کے پیش نظر تین سو افراد کو لارڈ نے تربیت دے کر مسلح کیا۔ یوں قصبے کی حفاظت کے لیے ایک ہزار افراد موجود تھے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید افراد کی گنجائش پیدا ہوتی گئی۔ یوں لارڈ بیڈن پاؤل کے ذہن میں ''اسکاؤٹ تحریک'' کا خیال آیا۔ لارڈ نے اس مقصد کے لیے نوجوانوں کا ایک دستہ تشکیل دیا۔ انہیں وردی پہنا کر ڈرل کی تربیت دی۔ یہ تجربہ مفید اور کام یاب رہا کیوں کہ جو کام فوجی کرتے تھے، وہ اب ان تربیت یافتہ نوجوانوں کے سپرد تھا، جب کہ فوجیوں کو اب صرف لڑائی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ''میف کنگ'' نامی قصبے کی حفاظت کے لیے ان نوجوانوں کی کارکردگی مثالی رہی۔ چناں چہ 1901ء میں لارڈ بیڈن پاؤل نے جنوبی افریقہ سے انگلستان واپسی پر اسکاؤٹنگ کی ضرورت و اہمیت کی پیش نظر اس پر غور کیا اور 1907ء میں باقاعدہ طور پر اسکاؤٹ کیمپ کا آغاز ہوا۔ یہ اسکاؤٹنگ کی تاریخ کا پہلا کیمپ تھا، جس میں لارڈ نے اپنے ساتھ موجود نوجوانوں کو جنگل میں رہنے سہنے یعنی کٹھن مراحل سے نبرد آزما ہونے

کے گُر سکھائے۔ 1912ء میں لارڈ بیڈن پاؤل نے اسکاؤٹنگ کا بطور ایک عالمی تنظیم کے آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے دُنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کے اسکاؤٹس سے ملاقات کی۔

اسکاؤٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بااعتماد، فرماں وار، وفادار، خوش اخلاق اور مددگار ہوتا ہے۔ اسکاؤٹ مہربان، بہادر، پاکیزہ اور کفایت شعار ہوتا ہے۔

اسکاؤٹنگ میں شمولیت کے وقت ایک وعدہ لیا جاتا ہے کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ نیز پاکستان کے عائد کردہ فرائض، دوسروں کی امداد اور اسکاؤٹ قوانین کی پابندی کی جائے گی۔''

اسکاؤٹ سیکشن میں عمروں کے لحاظ سے بیجز کی ترتیب دی جاتی ہے۔ قائداعظم کے تین سنہری اصولوں اتحاد، تنظیم اور یقین محکم پر تین عام قابلیت کے بیجز رکھے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ ''اسلام سے آگہی'' اس میں حضرت محمد ﷺ، صحابہ کرامؓ، غزوات، حقوق العباد، قرآنی آیات اور خطبہ حجۃ الوداع شامل ہیں۔ پھر سیرت و کردار سازی ہے اور تیسری اپنے ملک سے متعلق اہم معلومات مثلاً قرار دادِ پاکستان، پاکستان کا سیاسی و دستوری ارتقا، آئینِ پاکستان، صدرِ پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔ دیگر تربیت اس کے علاوہ ہے۔ جب اسکاؤٹ اپنی تربیت مکمل کر لیتا ہے اور مختلف امور میں مہارت حاصل کر لیتا ہے تو اسے پاکستان کا اعلیٰ ترین بیج ''قائداعظم بیج'' دیا جاتا ہے۔ یہ بیج اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اسکاؤٹ تمام امور پر مہارت رکھتا ہے یا مکمل دسترس رکھتا ہے۔ 22 دسمبر 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے چیف اسکاؤٹ کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ 15 دسمبر 1947ء کو کراچی میں اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کا دوسرا اجلاس وزیرِ تعلیم اور چیف کمشنر اسکاؤٹ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ قائداعظم نے پاکستان بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے سربراہ یعنی چیف اسکاؤٹ بننے کی حامی بھر لی ہے، تاہم وہ اس سے قبل اسکاؤٹ تحریک کے باقاعدہ رکن بننا چاہتے ہیں۔ چناں چہ اس کے لیے 22 دسمبر 1947ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔

22 دسمبر 1947ء کو گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں ایک سادہ مگر پُر وقار تقریب منعقد کی گئی۔ اس رسم حلف برداری میں قائداعظم محمد علی جناح نے پادری اور سینئر اسکاؤٹس کی موجودگی میں باقاعدہ

اسکاؤٹ تحریک میں شمولیت کے لیے اسکاؤٹ جھنڈے پر بایاں ہاتھ رکھ کر دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کے ساتھ اسکاؤٹ سائن بناتے ہوئے حلف لیا۔ آپ کے حلف کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

''میں اپنی آن پر وعدہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اور ملک کے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی، ہر وقت دوسروں کی مدد اور اسکاؤٹ قانون کی پابندی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔''

اگر آپ قائداعظم کی زندگی کا بغور مطالعہ کریں تو ان کی عملی زندگی کا ہر پہلو اس اسکاؤٹ وعدہ پر حرف بہ حرف پورا اُترتا نظر آتا ہے۔ قائداعظم وہ پہلے سربراہ مملکت ہیں جنہوں نے باقاعدہ اسکاؤٹ حلف لے کر اس اسکاؤٹ تحریک کے عملی رکن بننے کا ثبوت دیا۔

قائداعظم نے اس تقریب کے اختتام پر قوم کے نام ایک پیغام بھی دیا۔ اپنے پیغام میں انہوں نے کہا۔ ''ہمارے نوجوانوں کا کردار بنانے میں اسکاؤٹنگ ایک اہم اور نمایاں خدمت ہے۔ یہ نہ صرف جسمانی، دماغی اور روحانی تربیت میں معاون ثابت ہو سکتی ہے بلکہ اس سے مفید، منظم اور قابلِ فخر شہری بھی تیار کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ہم ابھی ایک مثالی دُنیا سے بہت دور ایسے معاشرے و ماحول سے وابستہ ہیں۔ جہاں تہذیب و تمدن کی ترقی کے باوجود ابھی جنگل کا قانون جاری ہے۔ اگر ہم دُنیا کو بے خطر، پاکیزہ اور پُرسکون ماحول دینا چاہتے ہیں تو انسانی فلاح و بہبود کے اس مقدس فریضے کا آغاز افراد سے کریں۔ بچپن سے ہی ان کے دلوں میں اسکاؤٹنگ کے نصب العین اور بے لوث خدمت کے جذبے کو استوار کریں تاکہ ان کے خیالات، گفتار اور کردار میں پاکیزگی پیدا ہو جائے۔''

☆☆☆

ایک جنگل میں کوا اور چڑیا کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک ہی درخت پر رہتے تھے۔ چڑیا بی بہت محنتی تھی اور ہر کام کو وقت پر کرتی تھی۔ اس کے برعکس کوا بہت کاہل تھا اور آج کا کام کل پر نہیں بلکہ پرسوں پر ڈالنے کا عادی تھا۔

جب گندم کی بوائی کا وقت آیا تو چڑیا بی نے کوے سے کہا۔ ''کوے بھیا! چلو گندم بونے چلتے ہیں۔'' کوے نے کہا۔ ''چڑیا بی، تم چلو میں ابھی آتا ہوں اور تمہارے لیے کھانا لاتا ہوں تم بھی کھانا، میں بھی کھاؤں گا۔'' پھر چڑیا بی گندم بونے چلی گئی اور ادھر کوے بھیا نے خود کھانا کھایا اور مزے سے سو گیا۔ چڑیا بی بے چاری سارا دن گندم کا کام کرتی رہی اور شام کو آ کر کوے سے پوچھا کہ وہ کھانا لے کر کیوں نہیں آیا تو کوے نے کہا۔ ''وہ...... میں سو گیا تھا...... سوری...... جی۔'' اور پھر چڑیا نے کھانا کھایا اور سو گئی۔

صبح پھر چڑیا بی نے کوے بھیا کو کہا۔ ''چلو کوے بھیا! گندم بونے چلتے ہیں تو کوے نے پھر وہی جواب دیا۔ ''چڑیا بی، تم چلو میں ابھی آتا ہوں اور تمہارے لیے کھانا لاتا ہوں۔ تم بھی کھانا، میں بھی کھاؤں گا۔'' اس کے بعد چڑیا بی چلی گئی۔ کوا چونکہ بہت کاہل تھا، اس لیے وہ پھر کھانا لے کر نہ گیا اور بے چاری چڑیا بی بھوکی کام کرتی رہی۔ جب شام کے وقت چڑیا نے آ کر کوے سے پوچھا کہ وہ کھانا لے کر کیوں نہ آیا تو کوے نے پھر سے کوئی بہانہ بنا لیا اور پھر کوے نے یہ معمول ہی بنا لیا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتا اور چڑیا بھی کام کرتی رہی۔

جب گندم کی کٹائی کا وقت آیا تو چڑیا نے کوے سے کہا۔ ''چلو کوے بھیا، گندم کاٹنے چلتے ہیں'' لیکن کوے نے حسب روایت ٹال دیا اور چڑیا بی کٹائی کرتی رہی۔

جب گندم کی کٹائی مکمل ہو گئی تو چڑیا بی نے کوے بھیا سے کہا۔ ''چلو کوے بھیا، آج گندم اور بھوسی کا اپنا اپنا حصہ کر لیتے ہیں۔'' اب کوا فوراً تیار ہو گیا اور چڑیا بی کے ساتھ چل دیا۔ جب وہ کھیت میں پہنچے تو دیکھا کہ گندم اور بھوسی علیحدہ علیحدہ پڑے تھے۔ کوے نے کہا۔ ''یہ گندم والا ڈھیر میرا ہے اور بھوسی والا تمہارا۔'' یہ سن کر چڑیا بی نے کہا۔ ''کوے بھیا، یہ تو زیادتی ہے۔ تم ایسا کرو

کہ مجھے کچھ حصہ گندم کا بھی دے دو لیکن کوا یہ سن کر طیش میں آگیا اور کہا کہ اگر تم نے مجھ سے اب گندم کا تھوڑا سا حصہ بھی مانگا تو تمہیں ماروں گا۔

چڑیا بھی بہت صابر اور شاکر تھی، اس نے پھونس پر ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پھونس سے ایک اچھا سا گھر بنا لیا۔ وہ ہر روز محنت کرتی اور کھانا تلاش کرتی، خود بھی کھاتی اور کچھ جمع بھی کر لیتی تاکہ مشکل وقت میں کام آجائے۔

وقت گزرتا رہا اور برسات کا موسم آگیا۔ ادھر کوے بھیا نے گھر بھی نہ بنایا اور وہی گندم کھاتا رہا اور پھر چند دن کے بعد بارش شروع ہوگئی اور مسلسل ایک مہینہ ہوتی رہی۔ چڑیا بی اپنے گھر میں محفوظ رہی اور وہ تمام مہینہ اپنا جمع شدہ کھانا کھاتی رہی۔ جب بارش رک گئی تو چڑیا گھر سے باہر نکلی تو دیکھا کہ دانوں کے ڈھیر کے قریب کوا مرا پڑا ہے۔ چوں کہ کوے بھیا نے گھر نہ بنایا تھا اس لیے بارش میں بھیگ کر مر گیا۔ چڑیا بی نے کہا کہ واقعی لالچ ایک بری بلا ہے کوے نے دانوں کا لالچ کیا اور لالچ میں چڑیا سے دوستی بھی ختم کر دی اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بارش میں بھیگ کر ہلاک ہوگیا۔ کوا اگر گندم کا لالچ نہ کرتا اور دونوں اکٹھے رہتے تو شاید وہ بچ جاتا۔

☆☆☆

معلومات عامہ

☆ امریکہ کے مجسمۂ آزادی کی پہلی انگلی کی لمبائی 8 فٹ ہے۔
☆ جونک کی 4 ناک ہوتی ہیں۔
☆ ایک شارک مچھلی 100 سال تک زندہ رہ سکتی ہے۔
☆ کینگرو پیچھے کی طرف سے نہیں چل سکتے۔
☆ بغیر پانی پیئے چوہا اونٹ سے زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔
☆ پتنگا کچھ کھا پی نہیں سکتا، کیوں کہ بے چارے کا نہ تو منہ ہوتا ہے اور نہ ہی پیٹ۔
☆ کتے کے جسم کے صرف ایک حصے پر پسینہ آتا ہے وہ ہے اس کی زبان۔
☆ نر مچھر کسی کو نہیں کاٹتا، صرف مادہ مچھر کاٹتی ہے۔
☆ پیدائش کے وقت ہر انسان کی آنکھ کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔
☆ زیادہ ہنسنا انسان کے جسمانی وزن میں سے تقریباً 2 کلوگرام وزن بیکٹیریا پر مشتمل ہے۔
☆ ایک جسم کی تمام ہڈیوں کا کل ایک چوتھائی حصہ صرف پیروں میں پایا جاتا ہے۔
☆ انسانی جسم میں کاربن کی اتنی مقدار موجود ہے کہ جس سے ایک ہزار پنسل بھری جا سکتی ہے۔
☆ ایک اوسط انسانی آنکھ کا سائز پیدائش سے لے کر وفات تک یکساں رہتا ہے۔
☆ سر راس مسعود کو علامہ اقبال کے اشعار اتنی اچھی طرح یاد تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے علامہ اقبال کو ان ہی کے اشعار کی بیت بازی میں ہرا دیا تھا۔
☆ ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا میں اوسطاً ایک گھنٹہ میں 1650 شادیاں اور 155 طلاقیں ہوتی ہیں۔
☆ آپ یقین کریں کہ برصغیر کے مشہور موسیقار تان سین کی قبر پر اگے ہوئے بیری کے درخت کے پتے آج بھی اس امید پر چبائے جاتے ہیں کہ اس سے گلا سریلا ہو جائے گا۔
☆ ہماری زمین سورج کے گرد تقریباً 62,137 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگا رہی ہے۔
☆ وینزویلا میں سالتو آلنو کا آبشار، نیاگرا سے 20 گنا زیادہ بلندی پر واقع ہے۔
☆ ایک مکھی (Dragon Fly) کی عمر صرف 24 گھنٹے ہوتی ہے۔
☆ گندھک کا تیزاب 1300ء کے لگ بھگ دریافت ہوا تھا۔
☆ بلی کے کان میں 32 پٹھے (Muscles) ہوتے ہیں۔
☆ دریائے نیل کی کل لمبائی 4157 میل ہے۔
☆ آئن سٹائن، نیوٹن اور پاسچر اسکول میں نالائق ترین شاگرد شمار کیے جاتے تھے۔
☆ عظیم موجد اور سائنس دان، مائیکل فیراڈے بہت کم تعلیم یافتہ تھا۔
☆ مریخ کے چاند دریافت کرنے والا انسان بال بنیادی طور پر بڑھئی تھا۔
☆ بلیو وہیل 6 ماہ تک بغیر کھائے پیئے زندہ رہ سکتی ہے۔
☆ 45 فٹ لمبی اور 50 ٹن وزنی وہیل شارک بہت چھوٹے جانوروں پر گزارا کرتی ہے۔
☆ تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ گولڈ فش (Gold Fish) کو صرف 3 سیکنڈ تک کوئی شے یاد رہتی ہے۔
☆ مچھلیوں کی کچھ اقسام مرتے وقت رنگ بدل لیتی ہیں۔
☆ سمندر میں 500 مختلف اقسام کی مچھلیاں بجلی خارج کرتی ہیں۔
☆ مادہ Angler Fish اپنے نر سے چھ گنا بڑی ہوتی ہے۔
☆ ایک اونس سونے سے پچاس میل لمبا تار بنایا جا سکتا ہے۔
☆ الجبرا اب سے کوئی 3,500 سال قبل وضع کیا گیا تھا۔
☆ لفظ zero اطالوی لفظ zephirum سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ''خالی'' ہے۔
☆ شتر مرغ کی آنکھ اس کے دماغ سے بڑی ہوتی ہے۔
☆ شتر مرغ کا انڈا سب سے بڑا ہوتا ہے جسے ابالنے میں 40 منٹ لگتے ہیں۔
☆ ایک جیٹ جہاز اڑانے سے 110 تا 140 ڈیسی بل تک شور پیدا ہوتا ہے۔
☆ ایک صحت مند انسان صرف 7 منٹ میں نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام

جب اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو آباد کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے اپنے اس ارادے کا ذکر فرشتوں سے کیا اور فرمایا کہ ”میں اس دُنیا میں اپنا نائب (خلیفہ) بنانا چاہتا ہوں؟“ اس پر فرشتوں کو بہت تعجب ہوا اور انہوں نے عرض کی۔ ”اے اللہ! ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری حمد کے گیت گاتے رہتے ہیں تو ایسے انسان کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو دُنیا میں فتنہ و فساد اور خونریزی پھیلائے گا۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”جو میں جانتا ہوں۔ وہ تم نہیں جانتے۔“ فرشتوں نے اعتراف عجز کیا اور خاموش ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مٹی سے آدم کے وجود کو بنایا اور اس میں روح داخل کر کے اس کو گوشت پوست کا ایک چلتا پھرتا انسان بنا دیا۔ اب خداوند کریم نے آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے علم سکھایا اور کچھ چیزوں کے نام اور خواص بتا دیئے اور پھر فرشتوں سے ان چیزوں کے نام دریافت کیے۔ انہوں نے عرض کی۔ ”ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ جتنا علم تو نے ہم کو دے رکھا ہے۔“ آدم سے پوچھنے پر اس نے نہایت صحیح جواب دیئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ”میں نہ کہتا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے اور میں تمہارے پوشیدہ تمام بھیدوں سے واقف ہوں۔“ اب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس بندۂ خاکی کے آگے جھک جاؤ اور سب فرشتے بفرمان خداوندی کے مطابق آدم کے آگے جھک گئے مگر ابلیس نے جو دُنیا میں شیطان کے نام سے مشہور ہے، سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور تکبر و غرور میں آ کر کہا کہ ناری ہو کر میں ایک خاکی کے سامنے کیسے جھک سکتا ہوں۔ اس پر خداوند تعالیٰ نے شیطان کو مردود قرار دے کر اپنے دربار سے نکال دیا۔ شیطان نے خدا سے مہلت طلب کی کہ ”جس کے لیے تو نے میری تمام عمر کی عبادت کو برباد کر دیا ہے۔ میں اس کو اور اس کی اولاد کو ہر طریقے سے راہِ ہدایت سے بھٹکاؤں گا اور بہکاؤں گا۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”جاؤ، تم جو بھی چاہو کرو۔ جو لوگ تیری پیروی کریں گے۔ میں ان سے دوزخ کو بھر دوں گا جو بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے لیکن دُنیا میں میرے ایسے بندے بھی ہوں گے جو تیرے فریب میں نہیں آئیں گے اور اللہ تعالیٰ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں گے۔ ایسے لوگ ہی جنت کے حق دار ہیں، جہاں بہترین نعمتیں موجود ہیں اور جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔“

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 فروری 2016ء ہے۔

کھوج لگائیے

نام: ____

شہر: ____

مکمل پتا: ____

موبائل نمبر: ____

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 فروری 2016ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____

مقام: ____

مکمل پتا: ____

موبائل نمبر: ____

آخری تاریخ 08 فروری 2016ء ہے۔

ہونہار مصوّر

نام ____ عمر ____

مکمل پتا: ____

موبائل نمبر: ____

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کر کے اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____ شہر ____

مقاصد ____

موبائل نمبر: ____

اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔
HONEY
COLA
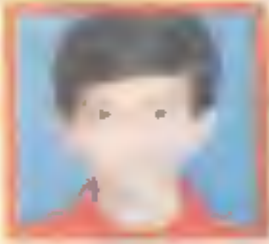
فراست ریاض، کراچی

میں فوج میں شامل ہو کر ملک کی حفاظت اور ماں باپ کا نام روشن کروں گا۔

غزل حسنین، نوشہرہ

میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

ارسلان شہزاد، کراچی

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

محمد حسن محمود، لاہور

میں انجینئر بن کر ملک کی خدمت کروں گا۔

مریم بابر، لاہور

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

حماد الرحمٰن، کراچی

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

حافظ عبدالستار، جھنگ

میں بڑا ہو کر مفتی اور قاری بنوں گا۔

محمد مظفر قریشی، لاہور

میں بڑا ہو کر ایئرفورس میں شامل ہوں گا اور اپنے وطن کی حفاظت کروں گا۔

محمد زعیم، خانیوال

میں بڑا ہو کر خدمت خلق کروں گا۔

سحر جاوید، سیالکوٹ

میں ڈاکٹر بن کر بیماروں کا مفت علاج کروں گی اور اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

اقصیٰ نور، بتری خیل

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

محمد تقی معاویہ، حیدرآباد

میں عالم دین بن کر اسلام کی روشنی پھیلاؤں گا۔

فرحین جاوید، سیالکوٹ

میں استانی بن کر علم کی روشنی پھیلاؤں گی۔

منحیٰ، لاہور

میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور بچوں کو مفت تعلیم دوں گی۔

محمد عثمان، اٹک

میں عالم دین بن کر دنیائے اسلام کی خدمت کروں گا۔

حسن جاوید، سیالکوٹ

میں سپاہی بن کر اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد عبدالرحمٰن نعیم، لاہور

میں دین کا داعی اور اللہ کا سپاہی بنوں گا۔ اللہ مجھے اس پر کاربند رکھے۔ آمین!

دعا ساجد، لاہور

میں شاعرہ بنوں گی۔

اشمل فیاض، راولپنڈی

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

1- یہ دُنیا فانی ہے
پتھر میں پانی ہے

2- سفید مرغی نیلے پاؤں
چل میری مرغی گاؤں گاؤں
جو بھی اسے دیکھے
خوشی سے اُچھل پڑے

3- ایک تلوار دو دھاری
جس نے کاٹی کھیتی ساری

4- ہر اک جانے اس کا نام
ہر گھر میں ہے اس کا کام
سیدھا ہو تو ہے تلوار
کبڑا ہو تو ہے بے کار

5- زندہ نہیں مگر زندوں سے تیز
پرندہ نہیں مگر پرندوں سے تیز

6- پانی پی پی پھول رہی ہے
پیٹھ پہ جھولا جھول رہی ہے

7- جب دیکھو پانی میں پڑا ہے
پانی بہتا ہے وہ کھڑا ہے

8- بات چھپے نہ اس سے اصلی
گن لے سب کی ہڈی پسلی

جوابات: 1- برف 2- خط اور اس کا لفافہ 3- بلیڈ 4- چاقو
5- ہوائی جہاز 6- جونک 7- عکس 8- ایکسرے

اس تصویر میں 9 غلطیاں ہیں۔ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھئے اور
ان میں سے جو غلطیاں ہیں انہیں الگ کاغذ پر لکھتے جایئے۔

خلوصِ دل میں جاگزیں ہو تو بنتی ہے دوستی
مٹ سکتے ہیں رشتے نہیں مٹتی ہے دوستی
جب غم کسی کی ذات سے منسوب ہوتا ہے
تو ابر رحمت بن کر برستی ہے دوستی
(نازیہ نوازی، نوشہرہ کینٹ)

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

☆

ناز کر اپنی قسمت پر اے نوعِ بشر
مصطفیٰؐ مل گئے اور کیا چاہیے
(ثمن رؤف، لاہور)

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

☆

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
(حسیب الرحمن، ڈیرہ اسماعیل خان)

سجدوں کے عوض فردوس ملے یہ بات مجھے منظور نہیں
بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں
(فرزمہ چوہدری، مقدس چوہدری، راول پنڈی)

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر
(مثیرہ سلیمان بٹ)

تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو
کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے
(شیربنیہ ثناء، حیدر آباد)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!
(عاتکہ قاسم، لاہور)

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

☆

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
(زینب محمود، جہلم)

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
(تماضر ساجد، صادق آباد)

اے نوجواں مسلم کبھی تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ
(حدیقہ عارف، لاہور)

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم!
اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ، ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم
(نسیرا اکبر، راول پنڈی)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
(ثناء مراد، چکوال)

گریپ فروٹ

گریپ فروٹ (Grape Fruite) کو عربی میں "زنباغ" بھی کہا جاتا ہے۔ اس سدا بہار درخت کا سائنسی نام "Citrus

Paradisi" جب کہ خاندان "Rutaleae" ہے۔ اس درخت کی اُونچائی 5 سے 6 میٹر (16-20 فٹ) اور کبھی کبھار 40 فٹ سے بھی بلند ہو جاتی ہے۔ گہرے سبز پتے 15 سینٹی میٹر (تقریباً 6 انچ) تک ہوتے ہیں۔ ان کا پھول سفید اور 4 پتیوں (Petals) پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ اس کا پھل جسے شوق سے کھایا جاتا ہے کا قطر (Diameter) 10 تا 15 سینٹی میٹر (4 تا 6 انچ) ہوتا ہے۔ پھل میں جوس بھرا ہوتا ہے جو تیزابی (Acidic) ہوتا ہے۔ یہ پھل 1750ء میں متعارف ہوا۔ اس کی متعدد اقسام (Cultivers) دستیاب ہیں۔ چین، امریکہ، میکسیکو، تھائی لینڈ اور جنوبی افریقہ گریپ فروٹ پیدا کرنے والے بڑے ممالک ہیں۔ اسلامی دُنیا میں ترکی اور سوڈان آتے ہیں۔ پاکستان میں بھی گریپ فروٹ اُگایا جاتا ہے۔ اس پھل کا جوس وٹامن بی، سی اور اے کا خزانہ ہے۔ ان کے علاوہ نمکیات میں کیلشیم، آئرن، میگنیشیم، میگنیز، فاسفورس، پوٹاشیم اور زنک بھی پائے جاتے ہیں۔

مرغی کا انڈہ

دُنیا بھر میں مرغی کا انڈہ (Hen's Egg) بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے کیوں کہ یہ 74 فی صد پانی، 13 فی صد پروٹین اور 11 فی صد چکنائی کا خزانہ ہے۔ ایک فی صد Ash بھی موجود ہے۔ بنیادی طور پر مرغی کا انڈہ ایک زائی گوٹ (Zygote) ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ بیرونی خول (Shell) جس میں 10,000 سوراخ ہوتے ہیں تاکہ ایمبریو سانس لے سکے۔ سفیدی

(White) جو انڈے کا 60 فی صد ہے، اس میں پانی، نمکیات اور پروٹینز ہوتی ہیں۔ انڈے میں وٹامن B_2 بھی موجود ہوتی ہے۔ انڈے کا تیسرا حصہ زردی (Yolk) پر مشتمل ہوتا ہے۔ انڈے کے کل وزن کا یہ 28 فی صد ہے۔ اس حصے میں چکنائی اور پروٹین پائی جاتی ہیں۔ کولیسٹرول نامی چکنائی بھی اسی حصے میں ہوتی ہے۔ ایمبریو اس حصے سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ انڈے کے چھلکے تلے جھلی پائی جاتی ہے جسے "Amnion" کہا جاتا ہے۔ انڈے کا وزن 40

گرام سے 75 گرام تک ہوسکتا ہے۔ مرغی کے انڈوں کی پیداوار کے اعتبار سے چین، امریکہ، بھارت، جاپان اور میکسیکو بڑے ممالک ہیں۔ بچوں کی دل چسپی کے لیے ہین کیچنگ (Hen Catching) گیمز (Games) اور کارٹونز بھی بنائے گئے ہیں۔

گوتم بدھ

بدھ مت مذہب کے بانی گوتم بدھ کو ''بدھا'' اور ''بدھ'' (Gautama Buddha) بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کی درست تاریخ پیدائش دستیاب نہیں۔ اندازہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے 4 سے 5 سو سال قبل آپ ریاست کپل وستو (Kapilavasto) کے راجہ کے گھر پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ اب نیپال میں ہے۔ والد کا نام "Suddhodana" اور والدہ کا نام "Maya" تھا۔ گوتم، خاندان کا نام تھا۔ شاہی خاندان سے تعلق کی

بناء پر ابتدائی تعلیم کے بعد گھڑ سواری اور تیراندازی، شمشیر زنی و سپہ گری کے گر سیکھے لیکن گوتم بدھ سادہ دل، رحم دل اور نرم گفتار شخص تھے۔ 18 برس کی عمر میں خوبرو شہزادی ''یشودرا (Yasodhara)'' سے شادی ہوئی۔ شادی کے دس برس بعد بیٹا پیدا ہوا جس کا نام "Rahula" رکھا گیا۔ گوتم بدھ کو خون خرابے، جھوٹ، مکاری، دھوکہ دہی سے نفرت تھی۔ بچپن سے دولت کی آرزو نہ تھی۔ اترپردیش، بہار، نیپال، ویت نام وغیرہ سے علوم حاصل کیے اور لوگوں کو پاکیزہ اور پارسا زندگی کے بارے درس دیے۔ یوں بدھ مت مذہب کی بنیاد پڑ گئی۔ بے شمار ڈرامے، فلمیں، ناول اور کہانیاں آپ سے منسوب ہیں۔ متعدد شعراء کرام نے آپ کی شخصیت پر شاعری بھی کی ہے۔ گوتم بدھ نے 80 برس کی عمر پائی۔

سم

موبائل فون میں استعمال ہونے والی سم (Sim) کا مطلب "Subscriber Identity Module" ہے۔ سم (SIM) ایک متحد سرکٹ (Integrated Circuit) ہے جو صارف (استعمال کرنے والا) کی شناخت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دُنیا بھر میں موبائل کمپنیاں اپنی اپنی SIM متعارف کرواتی ہیں جو کسی

نیٹ ورک سے منسلک ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے TS 11.11 کے نمبر سے یورپین ٹیلی کمیونیکیشن اسٹینڈرڈ انسٹی ٹیوٹ نے SIM متعارف کروائی تاہم پہلا SIM کارڈ 1991ء میں میونخ سمارٹ کارڈ میکر "Giesecke and Devrient" نے متعارف کروایا۔ آج کے SIM کارڈ 5 وولٹ، 3 وولٹ اور 1.8 وولٹ کو سپورٹ کرتے ہیں۔ سم میں نیٹ ورک کے بارے معلومات (Data) موجود ہوتی ہیں۔ یہ ڈیٹا 32 KB سے 128 KB تک ہوتا ہے جس میں 250 رابطے سٹور ہو سکتے ہیں۔ SIM استعمال کرنے والے کی معلومات انٹرنیشنل سطح پر دستیاب ہوتی ہیں جس میں نام پتے سے لے کر فون کرتے وقت مقام (Location) کی نشاندہی بھی شامل ہے۔ 2003ء سے مائیکرو SIM اور 2012ء سے Nano Sim بھی میسر ہیں۔ ہمارے ہاں Dual Sims (SIMs) بھی استعمال ہو رہی ہیں۔ ☆☆

اسکول میں ٹیسٹ شروع ہو چکے تھے اور آج تیسرا پرچہ تھا۔ شاہ ویز کینٹین میں داخل ہوا تو اسے فاران بھی وہیں نظر آ گیا۔ ''ارے شاہ ویز، تم آج کینٹین کیا لینے آ گئے؟'' فاران نے حیرت سے پوچھا۔ ''دراصل یار آج خانساماں چھٹی پر تھا اور مما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے سوچا آج کینٹین سے ناشتا کر لوں۔'' شاہ ویز نے بتایا اور کرسی گھسیٹ کر فاران کے ساتھ بیٹھ گیا۔

شاہ ویز اور فاران گہرے دوست تھے۔ فاران ہمیشہ اسکول آ کر کینٹین سے ناشتا کرتا جب کہ شاہ ویز کینٹین کے کھانے کو ناقص اور غیر معیاری کہتا اور کبھی کینٹین سے کوئی چیز لے کر نہ کھاتا۔ اسی لیے آج فاران اس کے کینٹین آنے پر حیران تھا۔ ''پرچہ کی تیاری کیسی ہے؟'' شاہ ویز نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''تیاری تو بہت اچھی ہے اور میرے خیال سے تیاری تو میری ہر بار ہی بہت اچھی ہوتی ہے مگر نہ جانے کیوں میرے مارکس اچھے نہیں آتے۔'' فاران نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! اب آرام فرمانے کی ضرورت نہیں ہے، چلو چلیں۔'' شاہ ویز نے اسے کہا اور دونوں کلاس کی طرف بڑھ گئے۔

پرچہ اگرچہ کافی مشکل تھا مگر شاہ ویز خوش تھا کہ بہر حال اس کا پرچہ بہت اچھا ہوا تھا۔ فاران قدرے چپ تھا۔ ''مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ تم اچھے خاصے ذہین ہو، تمام استاد بھی تمہاری پڑھائی کی تعریف کرتے ہیں، کبھی تم نے ہوم ورک میں کوتاہی نہیں کی پھر امتحان میں کیا ہو جاتا ہے تمہیں؟'' شاہ ویز نے فاران سے پوچھا۔ ''پتا نہیں یار، میں نے تیاری تو خوب کی تھی لیکن......'' فاران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''سنو! پرسوں ریاضی کا پرچہ ہے۔ میں کل چھٹی کے دن تمہارے گھر آ جاؤں گا اور مل کر پرچے کی تیاری کریں گے۔'' شاہ ویز نے کہا۔ ''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' فاران نے اتفاق کیا۔

''ماشاء اللہ! یہ پرچے کی تیاری ہو رہی ہے۔'' شاہ ویز نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فاران سے پوچھا جو ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ ''نہیں نہیں یار، بس تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' فاران نے جلدی سے ٹی وی بند کیا۔

''ویسے تمہارے کمرے میں بیٹھنے کی جگہ کون سی ہے؟'' شاہ ویز نے ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں ایسے ہی چیزیں پھیلا لیتا ہوں۔ امی جان سے ڈانٹ بھی پڑتی ہے لیکن چیزیں کب بکھر جاتی ہیں، مجھے پتا ہی نہیں چلتا۔'' فاران نے کپڑے، جوتے اور کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میری کتابیں ایسے ہی گری رہتی ہیں۔'' فاران

نے لاپروائی سے کہا اور نوٹس نکالنے الماری کی طرف بڑھ گیا۔ ''کیا مطلب، تم کتابیں پڑھنے کے بعد پھینک دیتے ہو؟'' شاہ ویز نے فاران کے ہاتھ سے نوٹس پکڑے۔ ''بھئی جب پڑھائی کر کے تھک جائیں تو کتابیں اُٹھانے کا ہوش کسے رہتا ہے۔'' فاران نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آج مجھے تمہارے خراب رزلٹ آنے کی وجہ معلوم ہو گئی۔'' شاہ ویز نے نوٹس پر سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے، ذرا مجھے بھی بتاؤ۔'' فاران نے پوچھا۔ ''فاران یار، تم اپنی کتابوں کی بالکل عزت نہیں کرتے اور تمہارے نوٹس تو مٹی پڑنے کی وجہ سے بہت خراب ہو گئے ہیں۔ دیکھو فاران! ہمارے اچھے مستقبل کے لیے کتابیں ہماری مدد کرتی ہیں۔ ہم کتاب کو اپنا دوست کہتے ہیں تو کیا دوست کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ کتابوں کی حفاظت اور احترام ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم انہیں دھیان سے نہیں رکھیں گے تو ہم میں اور ان پڑھ لوگوں میں کیا فرق رہ جائے گا؟'' شاہ ویز نے فاران کو سمجھایا۔ ''تو کیا میرا رزلٹ اس لیے خراب آتا ہے کہ میں کتابوں کی عزت نہیں کرتا؟'' فاران نے افسردگی سے پوچھا۔ ''بالکل یہی بات ہے۔ اب دیکھو نا جس جگہ جوتے رکھتے ہو، اس کے برابر کتاب کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ کتابیں ہمارا بہترین اثاثہ ہیں، ہمیں اچھے بُرے میں تمیز سکھاتی ہیں، ہمیں اچھی زندگی گزارنے کے طریقے بتاتی ہیں۔ اگر میں تمہیں کتاب کا ایک ایک فائدہ بتانے لگا تو شاید کوئی فائدہ رہ ہی جائے۔ مختصراً یہ کہ کتابیں زندگی کا ہر پہلو سنوارنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود اگر کتاب کا احترام ہی نہ کیا جائے تو ایسے علم کا کیا فائدہ؟'' شاہ ویز نے کہا۔

''سوری شاہ ویز! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اپنی کتابوں کا خاص خیال رکھوں گا۔ سمجھانے کا بہت شکریہ!'' فاران نے شرمندگی سے کہا۔ ''اتنی اچھی باتیں سمجھانے کے لیے تمہیں میرا شکریہ تو واقعی ادا کرنا چاہیے لیکن سوری مجھے نہیں کتابوں سے کہو۔'' شاہ ویز نے ہنس کر کہا تو فاران بھی ہنس دیا۔ ''آج کا دن تو تمہیں سمجھانے میں لگ گیا اور پرچے کی تیاری؟'' شاہ ویز نے کہا۔ ''جو تیاری آج ہونی ہے نا، وہ ساری زندگی میرے کام آئے گی۔'' فاران نے کتابوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''واہ! باتیں تو خوب آتی ہیں جناب کو۔'' شاہ ویز ہنسا۔ ''ہاں! بس عمل ہی نہیں تھا۔'' فاران نے بھی ہنس کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں، آج سے وہ بھی شروع۔'' شاہ ویز نے ہاتھ بڑھایا۔

''ان شاء اللہ!'' فاران نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

کھوج لگانے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

بانیہ رضا، لاہور۔ حرا ارشد، سارا ارشد، سرگودھا۔ عروج علی، لاہور۔ سندس آسیہ، کراچی۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ محمد سعد، لاہور۔ نور الایمان، فیصل آباد۔ اریبہ طاہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ منیزہ آصف، لاہور۔ عبدالرحمٰن دانیال، لاہور۔ زہرہ فاطمہ، لاہور۔ احمد ظفر، لاہور۔ شاہزہ زاہد، لاہور۔ فائق علی، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ رضوانہ شفق، لاہور۔ صباحت تنویر، پشاور۔ زینب آصف، لاہور۔ عائشہ سید، مریم سید، پشاور۔ حافظہ شاہ عروج، فیصل آباد۔ محمد حسن نصور، لاہور۔ حبہ رحمان، اکوڑہ خٹک۔ اقراء صدیقی، دہاڑی۔ اسامہ بن طاہر، بہاؤ الدین۔ سید احمد ضیغم، پشاور۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ عائشہ مجید، لاہور۔ ثمرہ افضل، جھنگ صدر۔ شفیق احمد، دیر۔ محمد ذیشان اقبال، پشاور۔ طوبیٰ، لاہور۔ سید نعیم احمد، لاہور۔ حفصہ اعجاز، بازہ ہملٹ۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ طلحہ محمود ملک، لاہور۔ صبا، اصغر، لاہور کینٹ۔ محمد ارحم عمران، ملتان۔ فرحان سعید احمد، لاہور۔ علینا اختر، کراچی۔ ثمن رؤف، لاہور۔ مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ مریم جاوید، مظفر آباد۔ ایمان زہرہ، لاہور۔ محمد نعیم کمبوہ، لاہور۔ وقاص احمد قادری، لالہ موسیٰ۔ احمد نواز، سمندری۔ تیمور ذوالفقار، لاہور کینٹ۔ دانیال حسن خان، میانوالی۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ فیضان ارشد، تاندلیانوالہ۔ عبدالرحمٰن عطاری، ساہی وال۔ زوہیب احمد، ملتان۔ وقار یونس، بورے والا۔ ظل ہما، کراچی۔ احسن اقبال، اسلام آباد۔ محمد ارشاد، بہاول پور۔ اظہر عباس، پشاور۔ عبداللہ نعیم، چنیوٹ۔ محمد جواد، بہاول نگر۔ رضوان بشیر، لاہور۔ اخلاق احمد، اوکاڑہ۔ فائزہ حنیف، گجرات۔ عائشہ نور، دہاڑی۔ معوذ الحسن، خانیوال۔ آصف نواز، واہ کینٹ۔ زوبیہ طارق، اسلام آباد۔ ہارون رشید، اوکاڑہ۔ نگہت سلیم، گجرات۔ مریم عبداللہ، پشاور۔ وقار صادق، راول پنڈی۔ آصفہ ممتاز، جھنگ۔ ظل ہما، کراچی۔ ثوبیہ سلیم، لاہور۔ رانا عبداللہ، ملتان۔ سعود الحسن، خانیوال۔ سجاد حیدر، کراچی۔ ظل ہما، حیدر آباد۔ جلال عابد بٹ، دینہ۔ نورین اشفاق، رحیم یار خان۔ عبدالغفور حیدری، کراچی۔ لائبہ بشیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ امتیاز عالم، واہ کینٹ۔ عائشہ نذیر، کراچی۔ عروسہ خالد، اٹک۔ احیان جاوید، حیدر آباد۔ عثمان حیدر، پشاور۔ محمد سلیمان بٹ، ساہی وال۔ مریم نواز، فیصل آباد۔ ندیم بیگ، نوشہرہ۔

پیارے بچو! نسیم عادل ایبٹ آباد میں یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ میں عرصہ پندرہ سال سے ایگزیکٹو مینیجر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ان کے ماشاء اللہ چار بچے تھے، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹے کا نام ارسلان تھا جو کہ دوسرے نمبر پر تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے گھر کے سب افراد ارسلان سے بہت لاڈ پیار کرتے تھے۔ امی جان ارسلان کو ہمیشہ اکیلا باہر جانے سے منع کرتی تھیں لیکن ارسلان میاں اکثر باہر اکیلے گھومنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے۔

شومئی قسمت ایک دن ارسلان اپنی امی کو بتائے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ امی جان چونکہ باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھیں، انہیں ارسلان کے گھر سے باہر جانے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ ارسلان گھر سے کچھ دور سڑک کنارے اپنے دھیان اکیلے چلا جا رہا تھا کہ ایک کار اس کے قریب آ کر رکی۔ آناً فاناً کار سے کچھ افراد اترے۔ انہوں نے ارسلان کے منہ پر رومال رکھا اور ارسلان کو اغواء کر کے کار میں ڈال کر لے گئے۔

ارسلان جس مقام پر پہنچا، اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند اور رسیوں میں جکڑے ہوئے پایا۔ ارسلان نے زور لگا کر رسیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ یہ کمرہ ایک گودام تھا جس میں استعمال کی کافی ساری چیزیں پڑی تھیں۔ ارسلان ان چیزوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے رسی کٹ جائے۔
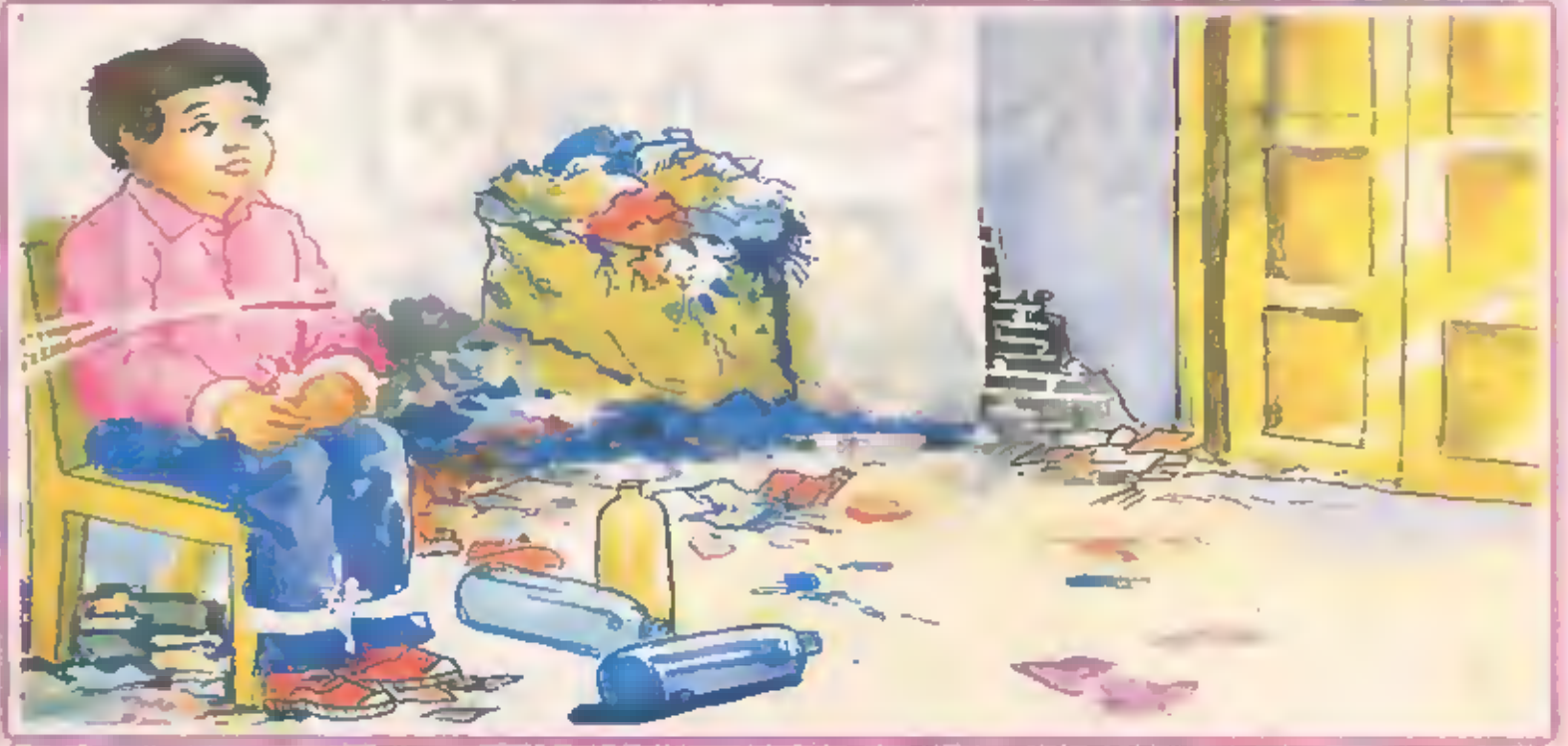
پیارے بچو! آپ سوچ سمجھ کر بتائیں کہ ارسلان نے کس چیز سے رسیوں کو کاٹ کر آزادی حاصل کی۔

جنوری 2016ء کے کھوج لگائیے کا جواب ہے: اسپورٹس کار میں ڈگی نہیں ہوتی۔

جنوری 2016ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- عمرانہ عنبرین، پشاور	2- حدیقہ عارف، لاہور
3- پرنس علی، ٹوبہ ٹیک سنگھ	4- شکیلہ اصغر، لاہور
5- بلال صفدر، ساہی وال	

جب ہم ساتویں جماعت میں فسٹ ڈویژن پاس ہوئے تو صاحب بس پوچھو مت۔ دُنیا بھر کی خوشیاں ہمارے گھر میں سمٹ آئیں۔ ابا جان اپنی گھنی مونچھوں میں ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ چھپانے کی لاکھ کوشش کرتے مگر موتیوں جیسے صاف اور چمک دار دانت تھے کہ نکلے پڑتے تھے۔ امی جان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ایک تو تھیں ہی سرخ سفید کہ ہاتھ لگائے میلی ہوں۔ اس پر خوشی کی لالی۔ بس چہرے پر شفق پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ہم سب دالان میں بیٹھے تھے۔ امی، ابا، ہم اور ہماری خالہ زاد بہن سیما۔ شرارت میں ہم سیر تو وہ خیر سے سوا سیر۔ بوا کریمن نے چلم بھر کر حقے پر رکھ دی۔ ابا جان نے پہلا کش ہی لگایا تھا کہ امی ہاتھ سے ناک دبا کر بولیں۔ ''توبہ! ناک سڑا دی تم نے تو۔ یہ موا حقہ کبھی پیچھا بھی چھوڑے گا؟ ہر وقت گڑ گڑ گڑ گڑ۔ دن بھر کھوں کھوں کھوں کھوں۔ بڑوں ہی کی دیکھا دیکھی بچے بُری عادتیں سیکھتے ہیں۔ میرا بس چلے تو ان موئے حقوں کا حقہ پانی بند کر دوں...... ہاں تو...... میں کہہ رہی تھی کہ بیٹا، خیر سے، امتحان میں پاس ہوا ہے اور نہ کوئی مٹھائی نہ خوشی۔ دُنیا سنے گی تو کیا کہے گی؟''

ابا جان بولے۔ ''آج کوئی نرالا تھوڑی پاس ہوا ہے۔ پہلے بھی تو پاس ہی ہوتا رہا ہے، ماشاء اللہ۔''

امی ہاتھ ہلا کر بولیں۔ ''پاس تو ہوتا رہا ہے مگر بھٹ ڈیزن کبھی پاس نہیں ہوا......''

بھٹ ڈیزن سن کر ہماری تو ہنسی نکل گئی، سیما نے منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا اور ابا جان مسکرا کر بولے۔ ''بھٹ ڈیزن نہیں، خدا کی بندی، فسٹ ڈویژن۔''

امی بولیں۔ ''اے وہ بھٹ ہو کہ فٹ۔ میں نے کون سا مڈل پاس کیا ہے۔ مجھے کیا پتا موا بھٹ ہوتا ہے کہ فٹ۔''

ابا جان بولے۔ ''مڈل پاس کیا ہوتا تو آج یہ بچے کاہے کو ہنستے؟ آج ہی انگریزی کی پہلی کتاب منگا لو۔ سعید سے دو حرف روز پڑھ لیا کرنا۔''

امی ہنس کر بولیں۔ ''اے خاک ڈالو۔ اب بڑھاپے میں گٹ پٹ کرنے بیٹھوں گی۔ ہاں تو، میں کہہ رہی تھی کہ خدا نے یہ خوشی کا موقع دیا ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی دعوت کر ہی ڈالو۔ اسی بہانے چار پیارے عزیز اکٹھے ہو جائیں گے۔''

ابا جان بولے۔ ''اچھا بھئی، اچھا۔ کل شام سب کو بلا لو۔ کھانے کے بعد قوالی بھی ہو گی۔ جھنڈے خاں، منڈے خاں قوالوں کو بلا

لیں گے۔"

ہم تالیاں بجا کر بولے۔ "آہاہاہا۔" سیما خوشی سے ناچنے لگی۔

امی بولیں۔ "تو میں کریمن کے ہاتھ سب کو بلاوا بھیجے دیتی ہوں۔"

برسات کے دن تھے مگر آسمان بالکل صاف تھا۔ کمرے چھوٹے چھوٹے سے تھے، اس لیے صحن میں شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد تمام لوگ قرینے سے بیٹھ گئے تو جھنڈے خاں، منڈے خاں نے ہارمونیم اور طبلے نکالے۔ ہمیں کہیں اور جگہ نہ ملی تو ہم نے کونے میں نارنگی کے پیڑ تلے ڈیرا لگا دیا۔ ہمارا لنگوٹیا یار سرمد بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس جگہ بالکل اندھیرا تھا۔ ہم تو سب کو دیکھ سکتے تھے مگر ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہاں سے قوالوں تک کا فاصلہ مشکل سے آٹھ دس گز ہوگا۔

ایک تو جھنڈے خاں، منڈے خاں کی صورت ہی منحوس تھی، دوسرے انہوں نے جو گانا شروع کیا، وہ فارسی کا تھا۔ ہمارے خاک بھی پلے نہ پڑا۔ پھر مصیبت یہ کہ ایک ایک شعر کو دس دس بار کہتے۔ شور زیادہ مچاتے اور گاتے کم۔

ان میں ایک بڈھا طبلچی بھی تھا۔ اس نے اتنی زور سے طبلے پر ہاتھ مارا کہ ہم اچھل پڑے۔ جھنڈے خاں کانوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے چیخے۔ "اجی پشتم کے پشتم۔"

منڈے خان جھوم کر دہاڑے۔ "اجی واہ وا۔"

جھنڈے خان پھر زور سے ڈکرائے۔ "اجی پشتم کے پشتم۔"

اور تمام قوال کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "اجی واہ وا۔"

غرض آدھ گھنٹے تک وہ یہی پشتم پشتم کرتے رہے۔ ہم تنگ آ کر بولے۔ "یار سرمد، یہ تو سخت نامعقول قوال ہیں۔"

سرمد منہ چلاتے ہوئے بولا۔ "میرا بس چلے تو ان کے حلق میں کپڑا ٹھونس دوں۔"

ہم نے پوچھا۔ "یہ تو کیا کھا رہا ہے؟"

بولا۔ "الائچی دانے۔" اور یہ کہہ کر اس نے تھوڑے سے ہمیں بھی دے دیئے۔ چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ گول گول۔

یکا یک ہمیں شرارت سوجھی۔ بڑی انوکھی اور دلچسپ۔ دل مارے خوشی کے دھک دھک کرنے لگا۔ ہم نے ایک الائچی دانہ انگلی کے ناخون پر رکھا اور اسے انگوٹھے سے دبا لیا۔ جوں ہی ایک قوال نے آ آ آ کر کے منہ پھاڑا..... ہم نے الائچی دانہ پوری قوت سے اس کی طرف پھینکا۔ الائچی دانہ انگلیوں میں سے ایسے نکلا جیسے کمان سے تیر اور سیدھا اس قوال کے حلق میں گھس گیا۔ وہ خپ خپ کرتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جھنڈے خاں نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر آنکھیں میچ کر، حلق پھاڑ کر زور سے تان اڑائی۔

"آ آ آ آ آ۔"

ہم نے دوسرا الائچی دانہ انگلی پر رکھا اور جب جھنڈے خاں نے آ آ آ آ آ کرتے ہوئے ہماری طرف منہ کیا تو ہم نے ایک دم انگلی چھوڑ دی۔ نشانے کے ہم پکے تھے۔ الائچی دانہ سن سے انگلیوں میں سے نکلا اور جھنڈے خاں کے منہ میں گھس گیا۔ وہ بھی خپ خپ کرنے لگے۔

انہیں دیکھ کر طبلے والے بڈھے نے گلا صاف کیا اور لگا منہ پھاڑنے۔ ہم نے تیسرا الائچی دانہ انگلی پر رکھا اور انگوٹھے سے دبا کر اسے چھوڑنا چاہتے ہی تھے کہ ایک دم پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو سیما تھی۔

"س س سیما..... ت ت تم!" ہماری زبان لڑکھڑا گئی اور خون رگوں میں دوڑتے دوڑتے ایک دم رک گیا۔

آہستہ سے بولی۔ "ذرا ادھر تشریف لائیے۔ اٹھیے، جلدی کیجیے۔"

وہ آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے۔ صحن پار کر کے کمرے میں پہنچے تو دھیرے سے بولی۔ "تو یہ آپ تھے۔ کیوں؟ اگر میں خالو جان سے کہہ دوں تو؟"

ہم گھبرا کر بولے۔ "تو سیما بہن یہ جو چند بال تمہیں میری کھوپڑی پر نظر آ رہے ہیں، انہیں ابا جان کا جوتا اس طرح دھن کر رکھ دے گا جس طرح خیر دین دھنیے نے دادی اماں کے پرانے لحاف کی روئی دھن کر رکھ دی تھی۔ تمہیں یاد ہے، سیما ب ب بہن؟"

سیما مسکرا کر بولی۔ "ہاں، یاد ہے مگر بہت دنوں کے بعد آج بدلہ لینے کا موقع ملا ہے۔ گن گن کے بدلے لوں گی۔"

ہم آنکھوں میں آنسو بھر کے بولے۔ "سیما بہن، معاف کر دو۔ خدا آپ کو معاف کر دے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی کا ایک عیب چھپاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ستر عیب چھپاتا ہے۔"

سیما بولی۔ "ہم تمہاری طرح چغل خور نہیں۔ ہم تمہیں معاف کرتے ہیں مگر ایک شرط پر..... وعدہ کرو ہمیں روز املیاں لا کر دیا کرو گے۔ خوب کھٹی کھٹی۔"

ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں سیما بہن۔ روز آپ کو املیاں لا کر دیا کروں گا۔ آپ کے حساب کے سوال بھی کر دیا کروں گا۔ عید بقر عید پر پیسے ملیں گے تو وہ بھی آپ کو دے دیا کروں گا اور سیما بہن...... جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو راوی کے کنارے آپ کے لیے ایک شان دار محل بنواؤں گا اور اس میں کھٹی املیوں کا ایک عالی شان باغ لگواؤں گا۔ ہر درخت کے نیچے آم کے اچار کے مٹکے رکھے ہوں گے۔''

سیما کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

ہم بولے۔ ''تو اب میں جاؤں سیما بہن، پیاری بہن، ننھی بہن؟''

سیما بولی۔ ''ذرا ٹھہریے۔ تھوڑی سی سزا آپ کو ملنی ہی چاہیے۔ بس ذرا سی۔''

یہ کہہ کر اس نے سیدھا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھا، سیدھے ہاتھ کی کہنی تلے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی رکھی اور اس طرح جھومی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر ایک دم ڈانٹ کر بولی۔ ''کان پکڑو......!''

ہم نے جھٹ کان پکڑ لیے۔ کیا کرتے۔

وہ بولی۔ ''مرغا بنو......!''

ہم فوراً مرغا بن گئے۔

سیما بولی۔ ''ناک سے زمین پر لکیر کھینچو، لمبی سی۔''

ہم ایک دم سجدے میں گر پڑے اور ناک سے ایک گز لمبی لکیر زمین پر کھینچ دی۔

سیما نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ بس اب جاؤ۔''

کیسی قوالی اور کہاں کا گانا۔ جلدی سے کمرے میں گھسے اور چٹخنی لگا کر سو گئے۔

صبح اتوار تھی۔ خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔ آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ دو تین انگڑائیاں لیں، سلیپر پہنے اور غسل خانے کی طرف چلے۔ راستے میں ابا جان کا کمرا تھا۔ جب ہم کمرے کے پاس سے گزرے تو اندر سے آواز آئی: ''سعید صاحب......!''

ایسا معلوم ہوا جیسے زمین نے پیر پکڑ لیے ہوں۔ قدم نہ آگے اٹھتے تھے نہ پیچھے۔ اتنے میں پھر آواز آئی۔ ''سعید صاحب! سنا نہیں آپ نے؟''

ہم نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر بولے۔ ''اب اب ابا جان، آپ نے مجھے بلایا؟''

آواز آئی۔ ''جی ہاں، میں نے ہی آپ کو بلایا ہے۔ ذرا اندر تشریف لائیے۔''

ڈرتے ڈرتے، لرزتے، کانپتے اندر گئے۔ ابا جان کے چہرے کے سامنے اخبار تھا۔ انہوں نے اخبار کا ورق الٹا اور بولے۔ ''یہ رات آپ نے کیا حرکت کی تھی، میاں صاحب زادے؟''

ہمارا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ سوچتے تھے کہ زمین پھٹ جائے اور اس میں سما جائیں۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑے رہے۔

ابا جان نے اخبار میز پر رکھ دیا اور عینک ماتھے پر کر کے بولے۔ ''بیٹا! تم نے سمجھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ مذاق ہے، مگر ناسمجھی میں تم یہ نہ سمجھ سکے کہ بعض مذاق بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ فرض کرو، تمہارا الائچی دانہ منہ میں جانے کے بجائے قوال کی آنکھ میں لگ جاتا تو اس کی آنکھ پھوٹ جاتی۔ تمہارا تو مذاق ہو جاتا اور اس غریب کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھ سے ہاتھ دھونا پڑتے۔''

اتنا کہہ کر وہ آگے کو جھکے اور ایک ایک لفظ تول تول کر بولے۔ ''بیٹا، جو بچہ شرارت نہ کرے تو وہ بچہ نہیں ہوتا، فرشتہ یا ولی اللہ ہوتا ہے، مگر...... ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسی شرارت جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے یا ان کا دل دکھے شرارت نہیں، شیطانی ہے اور شیطانی کرنا شیطان کا کام ہے، انسان کا نہیں......''

ہم شرمندہ ہو کر بولے۔ ''ابا جان، اصل میں شیطان نے مجھے بہکا دیا تھا۔''

ابا جان بولے۔ ''ہاں ہاں، ہم بھی یہی سمجھے تھے۔ بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ تم جیسا سمجھ دار اور عقل مند بچہ ایسی ناسمجھی کی باتیں کرے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ تم ایسی بری حرکت نہیں کرو گے۔''

ہم جلدی سے بولے۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں، ابا جان۔''

خوش ہو کر بولے۔ ''شاباش! جیتے رہو۔ اب جاؤ، جا کر نہاؤ، ناشتا کرو۔ پھر ہمارے پاس آنا۔ کیرم کھیلیں گے۔ سیما کو بھی لیتے آنا۔''

ہم منہ لٹکائے باہر نکلے۔ دالان میں سیما دوپٹا منہ میں ٹھونسے کھڑی ہنس رہی تھی۔ ہمارے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر آگے بڑھے تو بولی۔ ''خالو جان! دیکھیے دیکھیے......!''

☆☆☆

محاورہ کہانی

پتھر میں جونک نہیں لگتی

زبیدہ سلطانہ

نوی اپنی کیاریوں کی صفائی کر رہا تھا کہ اسے مٹی میں ایک جونک مل گئی۔ وہ کیڑوں مکوڑوں میں بہت دل چسپی لیتا تھا۔ ڈرنے کی بجائے اس بدنما کیڑے کو تنکے پر اٹکائے امی کو دکھانے چلا آیا۔ ''امی! امی دیکھیں یہ سانپ کا بچہ......!''

امی نے دیکھا تو بولیں: ''ہائے ہائے یہ جونک کہاں سے اٹھا لائے؟ کہیں چمٹ جائے تو خون چوس لیتی ہے!''

''یہ میری کیاریوں میں چھپی بیٹھی تھی، اب دیکھنا میں اسے کیسا خون پلاتا ہوں۔''

''نہیں نہیں دفع کرو، باہر پھینکو اسے۔'' امی نے کہا۔

''میں اسے ایک ایسی چیز سے چمٹاؤں گا جس میں خون ہی نہیں ہوتا۔'' یہ کہہ کر نوی پھر اپنی پھلواری میں گیا اور ایک پتھر لے کر جونک کو اس پتھر سے چمٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ امی نے دیکھا تو خفا ہو کر بولیں: ''بیٹا! یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''بے وقوف لڑکے! پتھر میں بھی کبھی جونک لگی ہے؟ تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ باز آ جاؤ، اسے پھینک کر ہاتھ دھو اور ادھر آ کر اسکول کا کام کر لو مگر تم ہو کہ سنتے ہی نہیں۔''

امی خفا ہو کر بولیں تو نوی سب کچھ پھینک کر دوڑا آیا کیوں کہ اس کے ابو آ گئے تھے۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ آتے ہی کہنے لگے: ''بیگم! وہ کم بخت نادر تو کسی صورت رقم دینے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ صبح سے چار چکر اس کے ہاں لگا چکا ہوں۔''

باپ کی بات سن کر بڑا بیٹا ہنس کر بولا: ''ابو! آپ بھی تو نوی کی طرح پتھر میں جونک لگا رہے ہیں۔ نادر آپ کو ٹال رہا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ آپ کو کبھی بھی رقم نہیں دے گا۔''

بچو! جس آدمی سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہو مگر اس سے توقع رکھنا یا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے پتھر میں جونک لگانے کی ناکام کوشش کرنا، لہٰذا ایسی صورتِ حال میں یہ محاورہ کہا جاتا ہے۔

لزانیا سوپ

اجزاء:

اُبلا قیمہ: 300 گرام — پیاز: 1 عدد — ٹماٹر: 2 عدد — کٹا لہسن: 1 چائے کا چمچ
کٹی لال مرچ: آدھا چائے کا چمچ — کالی مرچ: 1 چائے کا چمچ — یخنی: 4 کپ — اُبلا پاستا: 1 کپ
اوریگانو: آدھا چائے کا چمچ — ٹومیٹو کیچپ: آدھا کپ — بیزل: 4 عدد — سرکہ: 2 کھانے کے چمچ
موزریلا چیز: آدھا کپ — تیل: 1 کھانے کا چمچ — نمک: حسب ذائقہ

ترکیب: پہلے 1 کھانے کا چمچ تیل گرم کر کے اس میں 1 چائے کا چمچ کٹا لہسن فرائی کر لیں۔ اب اس میں 300 گرام اُبلا قیمہ ڈال کر بھونیں۔ پھر اس میں 2 عدد ٹماٹر، 1 عدد پیاز، 1 چائے کا چمچ کالی مرچ، حسب ذائقہ نمک، 4 کپ یخنی اور آدھا چائے کا چمچ اوریگانو ڈال کر 10 منٹ پکا لیں۔ اب اس میں 1 کپ اُبلا پاستا، آدھا کپ ٹومیٹو کیچپ اور 2 کھانے کے چمچ سرکہ ڈال دیں۔ جب اس میں ایک سے دو اُبال آ جائیں تو اسے سوپ والے پیالے میں ڈالیں۔ آخر میں اوپر آدھا چائے کا چمچ کٹی لال مرچ، آدھا کپ موزریلا چیز اور 4 عدد بیزل ڈال کر سرو کریں۔

جنجر چکن سوپ

اجزاء:

چکن میٹ: ایک کلو — پیاز: چار عدد — ادرک: دو کھانے کے چمچ (پسی ہوئی) — چینی: آدھائی چمچ
مشروم (کھمبیاں): ایک کپ — یخنی: آدھا لیٹر — سویا ساس: تین کھانے کے چمچ — سرکہ: آدھا کپ
ٹماٹو ساس، کارن فلور: ایک کھانے کا چمچ — اجینو موتو: آدھائی چمچ — کوکنگ آئل: سوا آدھا کپ — نمک (سیاہ مرچ): حسب ضرورت

ترکیب: چکن میں چھ پیالی پانی، ایک پیاز اور سیاہ مرچ ڈال کر اُبالیں۔ جب پانی آدھا رہ جائے تو یخنی چھان کر الگ نکال لیں۔ اور اُبلے ہوئے چکن سے تمام ہڈیاں الگ کر کے گوشت الگ کر لیں۔ یخنی میں نمک، سویا ساس، ٹماٹر، چینی، سرکہ، کارن فلور ملا کر دس منٹ تک پکائیں۔ اُبلے گوشت کو فرائی پین میں آئل ڈال کر فرائی کریں اور پھر اس میں کٹی ہوئی مشروم اور پیاز ڈال کر چمچ سے ہلائیں۔ دھیمی آنچ پر پانچ منٹ دم لگا دیں۔ پیش کرتے کرتے وقت سلاد کاٹ کر اوپر ڈال دیں اور نوش کریں۔

ٹماٹو سوپ

اجزاء:

ٹماٹر: آدھا کلو — پیاز: 1 درمیانی سائز کی — لہسن: 4 جوے — ٹماٹو پیوری: 1 کپ
نمک: 1 چائے کا چمچ — آلو: 1 عدد چاپ کیا ہوا — چکن کی یخنی: 1 لیٹر — بریڈ سلائسز: 2 عدد
کریم: 6 کھانے کے چمچ — کٹی کالی مرچ: حسب ذائقہ

ترکیب: پین میں ڈال کر ساتھ ہی پیاز باریک کاٹ کر لہسن کے جوے، آلو، ٹماٹو پیوری اور ٹماٹر بھی کاٹ کر ڈال دیں۔ دھیمی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب سب کچھ اچھی طرح پک کر گل جائے تو چمچ سے تمام چیزوں کو اچھی طرح مکس کر کے اس سوپ کو چھان کر دوبارہ پکنے کے لیے رکھیں اور پکتے ہوئے اوپر سے جو جھاگ آ رہی ہو اسے اتارتے جائیں۔ ڈبل روٹی کے سلائسز کو ہلکا سا توسٹ کر کے چھوٹے چھوٹے کیوبز میں کاٹ لیں۔ اب پیالے میں سوپ ڈال کر اوپر کریم ڈال کر بریڈ کے کیوبز ڈال کر پینے کے لیے پیش کریں۔ نمک مرچ اپنے ذائقے کے حساب سے ڈال لیں۔

جھکا ہوا مینار

دُنیا کی سب سے مشہور عمارتوں میں پیسا کا مینار بھی کافی شہرت کا حامل ہے۔ اٹلی کے پیسا شہر میں یہ مینار گیارہویں کیتھڈرل صدی سے واقع ہے۔ یہ مینار جھکا ہوا ہے اور کئی برسوں سے یہ رفتہ رفتہ اور زیادہ جھکتا جارہا ہے۔ اب یہ بنیادی مقام سے تین سے پانچ میٹر تک جھک چکا ہے۔ اس مینار کی تعمیر 1173ء میں ہوئی تھی۔ یہ مینار اس وقت جھکنا شروع ہوا جب اس کی تین منزلیں بن کر تیار ہوئی تھیں۔ ایسا اس لیے ہوا تھا کیوں کہ اس کی اوپری بنیاد صرف تین میٹر گہری تھی جو کہ 55 میٹر لمبی عمارت کے لیے کافی نہیں تھی۔ اس کی بالائی منزلوں کو مینار کے جھکنے سے کوئی اثر نہیں پڑا لیکن یہ لگاتار جھکتا رہتا ہے۔

جینٹو پینگوئن

جینٹو پینگوئن قطب انٹارکٹیکا کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ برف سے ڈھکے ہوئے ان جزائر میں انڈے دیتے ہیں جہاں کا درجہ حرارت صفر ڈگری سے بھی کم ہوتا ہے۔ یہ جزائر کے ساحلوں پر عجیب ڈھنگ سے چلتے ہیں وہ اُڑ نہیں سکتے لیکن تیرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہ اپنے مضبوط پنکھوں کی مدد سے دوڑتے ہیں جو کہ چپو کے بلیڈوں جیسے ہوتے ہیں۔ یہ مچھلیوں اور سمندری کیڑوں کو کھاتے ہیں۔

ٹڈی

ٹڈیاں جو کہ عام طور پر دُنیا کے مشرقی وسطی خطے میں پائی جاتی ہیں، انہیں دُنیا میں سب سے زیادہ تباہی خیز کیڑا مانا جاتا ہے۔ ٹڈی ایک بہت بڑا گھاس کھانے والا کیڑا ہے، اپنی خوراک پودے اور اناج سے حاصل کرتا ہے۔ ٹڈیاں فصل والے کھیتوں کو تھوڑے ہی عرصے میں چٹ کر جاتی ہیں۔ یہ اکثر بڑے بڑے جھنڈوں میں چلتی ہیں۔ ان کے جھنڈ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلتے رہتے ہیں۔ جگہ بدلنے کے وقت یہ کھیتوں پر حملہ کرتے ہیں اور پوری طرح سے فصل کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کے جبڑے بہت طاقت ور ہوتے ہیں جو کسی بھی طرح کے اناج کو کھانے کا اہل ہوتا ہے۔

دُنیا کی سب سے بڑی شمسی گھڑی

برطانیہ کے فورس ماؤتھ بندرگاہ علاقے میں حال ہی میں کئی دیگر تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ایک شمسی گھڑی بھی نصب کی گئی ہے۔ دی نیو ملینیم سپیس نامی یہ گھڑی دُنیا کی سب سے بڑی شمسی گھڑی ہے جو گوس پورٹ ہمشائر میں لگائی گئی ہے۔ یہ گھڑی 17 میٹر جگہ پر مشتمل ہے۔

چھوٹا پرندہ

سب سے چھوٹا پرندہ کیوبا اور آئل آف یوتھ میں پایا جانے والا ہمنگ برڈ کی لمبائی 5.7 سینٹی میٹر ہوتی ہے جس میں سے آدھی لمبائی اس کی چونچ اور پونچھ کی ہوتی ہے اور وزن 1.6 گرام ہوتا ہے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ ہمنگ برڈ کے وزن کی حد کسی بھی گرم خون والے جانور کے مقابلے میں کم از کم ہوتی ہے۔

☆☆☆

پ	ہ	ج	ذ	ی	ر	ا	م	ی	ب
ہ	س	ع	ث	ظ	ن	ے	غ	ژ	ء
د	ر	م	س	ا	ف	ت	ڑ	م	خ
ا	ک	ز	ن	ء	ت	ح	ع	ش	ا
ر	ش	م	ش	و	م	ا	خ	و	ن
ا	ج	ح	ع	ہ	ٹ	غ	ف	ر	ی
ی	ن	ر	پ	و	ل	ی	س	ہ	گ
ث	گ	و	ے	ڑ	گ	چ	ا	ب	ن
ق	ل	م	ڈ	ض	ف	ہ	ذ	خ	ر
پ	ڈ	ب	م	ی	ل	ع	ت	ص	ق

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

مسافت، رنگین، بیماری، جنگل، تعلیم، ارادہ، خاموش، مشورہ، پولیس، محروم

صبح کے دس بج چکے تھے اور ریحان کو ابھی تک کوئی آرڈر نہیں ملا تھا۔ ریحان پچھلے دو گھنٹے سے اپنا ٹرک اڈے پر پارک کیے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا لیکن ابھی تک کچھ بھی نہیں بنا تھا۔

ریحان کی عمر چالیس سال تھی اور وہ بی اے پاس تھا۔ وہ پچھلے پندرہ سال سے اس شہر میں ٹرک ڈرائیوری کر رہا تھا۔ پہلے وہ کرائے پر مزدا چلاتا تھا۔ مزدا چھوٹے ٹرک کو کہتے ہیں جو عام طور پر سامان ڈھونے کے کام آتا ہے۔ ریحان اس کا بہترین ڈرائیور تھا، پھر آہستہ آہستہ اس نے خود یہ مزدا خرید لیا اور دس سال میں تھوڑی تھوڑی کر کے قسطیں اُتار دیں۔ اب وہ خود مالک تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا بلال ساتویں میں پڑھتا تھا اور چھوٹی بیٹی عالیہ چوتھی جماعت میں تھی۔ ٹرک ڈرائیوری سے اسے اتنی آمدن ہو جاتی کہ گھر آسانی سے چل جاتا تھا اور ویسے بھی وہ زیادہ دُور کے آرڈر نہ پکڑتا تھا تاکہ زیادہ مشقت سے بچ سکے۔ وہ ایک قناعت پسند انسان تھا۔

آج جمعہ کا دن تھا اور ریحان آٹھ بجے ہی ٹرک اڈے پر لے آیا تھا۔ دو گھنٹے سے وہ یوں ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ آخر تنگ آ کر نیچے اُترا اور ٹرک سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اس کی پُرانی عادت تھی کہ جب بور ہو جاتا تو ٹیک لگا کر گنگنانے لگتا۔ اڈے پر گہما گہمی نہ تھی، زیادہ تر ڈرائیور آرڈر لے کر اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اسے دو آدمی اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ دونوں شکل سے تاجر دکھائی دیتے تھے۔

''بابر شاپ تک جانا ہے۔'' ان میں سے ایک قریب آ کر بولا۔

''کیا لے کر جانا ہے؟'' ریحان نے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ چلو گے؟'' اسی شخص نے دوبارہ کہا۔

''آپ مال تو بتائیں!'' ریحان خوش اخلاقی سے بولا۔ ''کیوں نہیں چلیں گے، ہمارا تو کام ہی ہے خدمت آپ کی۔''

''اس سامنے والے گودام سے آلو کی بوریاں لوڈ کرنی ہیں اور بابر شاپ ہماری دوسری برانچ تک پہنچانی ہیں۔'' اسی بریف کیس

والے آدمی نے اڈے کے سامنے موجود عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ گودام؟" ریحان نے وضاحت چاہی۔ "وہی نیلے شٹر والا۔"

"ہاں وہی۔" وہ شخص بولا۔ "وہ ہماری مین برانچ ہے۔"

تھوڑی دیر میں ہی ریحان ان سے کرائے کا بھاؤ تاؤ کر کے اپنا ٹرک گودام تک لایا اور بوریاں لوڈ کر کے بابر شاپ کی طرف روانہ ہوا۔ ان دو اشخاص میں سے ایک ریحان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسرا وہیں گودام کے باہر رُکا رہا، وہ شاید گودام کا مالک تھا۔

ریحان یہ سفر شہر کی مرکزی سڑک سے کر رہا تھا۔ یہ سڑک بہت کشادہ اور صاف ستھری تھی لیکن اس کے باوجود یہاں ہر وقت ٹریفک کا اژدحام رہتا تھا اور حالت یہ ہوتی کہ ہر گاڑی والا یہ چاہتا کہ گاڑیوں کے اس سیلاب میں وہ پہلے نکل جائے، باقیوں کی خیر ہے۔

اڈے سے چلے ہوئے ریحان کو ابھی صرف دس ہی منٹ ہوئے تھے کہ اچانک پیچھے سے کسی ایمبولینس کا سائرن گونجا۔ ریحان نے سوچا کہ کوئی ایمبولینس کسی زخمی کو اسپتال لے کر جا رہی ہے اور اس کا سائرن زور زور سے بج کر گویا راستہ مانگ رہا ہے۔ سڑک بہت مصروف تھی۔ سائرن کی وجہ سے ہڑبونگ مچ گئی۔ کئی گاڑیاں راستہ دیتے ہوئے ہچکچا رہی تھیں لیکن طاقت ور سائرن کی آواز سے راستہ صاف ہوتا ہی جا رہا تھا اور ایمبولینس آہستہ آہستہ مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایمبولینس ریحان کے چھوٹے ٹرک کے عقب میں آ پہنچی۔

ریحان ٹریفک کے قوانین سے پوری طرح آگاہ تھا۔ جب اس نے ڈرائیونگ کا امتحان پاس کیا تھا تو اسے ٹریفک قوانین کی پوری تربیت دی گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مریض کا اسپتال پہنچنا اشد ضروری ہوتا ہے، لہٰذا کسی بھی ایمبولینس کو سب سے پہلے راستہ دینا چاہیے۔ چناں چہ اس نے ٹرک کو سائیڈ پر کرنا شروع کیا تاکہ ایمبولینس کے لیے جگہ بنے۔ ایمبولینس تیزی سے آگے بڑھی لیکن جیسے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ کے قریب سے گزری، ریحان نے غیر ارادی طور پر اس میں جھانکا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں سرے سے کوئی مریض ہی نہیں ہے بلکہ چار پانچ کالج کے لڑکے فرش پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ریحان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے جہاں تک ممکن ہو سکا ٹرک کو ایمبولینس کے ساتھ رکھا لیکن یہ سچ تھا کہ ایمبولینس کے فرش پر ایک لال دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر چند لڑکے ایک دوسرے کی طرف منہ کیے بیٹھے مزے سے گیم کھیل رہے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا کیوں کہ سائرن سے یہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ مریض کا اسپتال پہنچنا بہت ضروری ہے جب کہ مریض تو کوئی تھا ہی نہیں بلکہ محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ سب ڈراما کیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہی بابر اسٹاپ آ گیا اور ریحان نے دوسرے گودام میں بوریاں اتروا دیں لیکن اس کا ذہن مسلسل پچھلے واقعے کو سوچ رہا تھا۔ وہ دن معمول کے مطابق گزر گیا۔ شام کو جب وہ گھر پہنچا تو اس بات کو قدرے بھول چکا تھا۔ رات کو بیوی نے اس کے سامنے کھانا لا کر رکھا تو اسے پھر صبح والا واقعہ یاد آ گیا۔ اتنے میں بلال اور عالیہ بھی آ گئے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ رات کا کھانا سب مل کر کھاتے تھے۔ چناں چہ جب کھانا شروع ہو گیا تو ریحان ہی نے بات کا آغاز کیا۔

"آج میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔" اس نے کہا۔

"کیا بابا؟" عالیہ بھرے ہوئے منہ کے ساتھ ہی بولی۔ "کیا دیکھا آج آپ نے؟" چوں کہ عالیہ کے منہ میں نوالا تھا اور وہ اسی حال میں بول رہی تھی اس لیے اس کی آواز بگڑ گئی جس پر سب کو ہنسی آ گئی۔ ریحان نے اسے پانی پلایا اور صبح والا سارا واقعہ انہیں سنا دیا۔

"یہ تو عام سی بات ہے۔" ریحان کی بیوی نے کہا۔

"کیسے عام سی بات ہے؟" ریحان بولا۔ "کیا ہمارا قومی کردار اتنا بگڑ چکا ہے کہ ہم دوسروں کو تکلیف دے کر خوش ہوتے ہیں۔"

"بابا کالج کے سب لڑکے ہی ایسے ہیں۔" بلال نے پہلی بار زبان کھولی۔

"نہیں بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔" بلال کی امی نے اسے سمجھایا۔ "سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔"

"بہرحال ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" ریحان بات ختم کرتے ہوئے

بولا۔ "یہ تو لوگوں کے اچھے جذبات سے کھیلنے والی بات ہے۔"

اس کے کچھ دیر بعد وہ لوگ دسترخوان سے اٹھ گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ اس کے ساتھ آٹھ دن بعد اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہوا۔

ریحان لکڑی کی چند الماریاں لوڈ کر کے صدر کی طرف جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ شاداب کالونی سے ذرا آگے نکلا، سڑک پر کسی ایمبولینس کا سائرن بجنا شروع ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا، اسکولوں اور دفتروں میں چھٹی ہو چکی تھی۔ سڑک پر ہر قسم کی ٹریفک رواں دواں تھی۔ دھوئیں، گرمی اور شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی لیکن ایمبولینس کا سائرن زور زور سے بج کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ مریض کا جلد از جلد اسپتال پہنچنا ضروری ہے۔

چناں چہ لوگوں نے مریض کی مجبوری سمجھتے ہوئے اپنی گاڑیوں کو دائیں بائیں کرنا شروع کیا۔ سڑک بیچوں بیچ سے صاف ہوتی گئی۔ ایمبولینس تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی جب ریحان کے ٹرک کے پیچھے پہنچی تو اس نے بھی اپنا ٹرک ایک طرف کیا۔ جب ساتھ سے ایمبولینس گزری تو اس نے اپنی بلند سیٹ سے پھر اس میں جھانکا۔ اسے پھر حیرت ہوئی کہ ایمبولینس میں مریض نہ تھا بلکہ کالج کے نوجوان بیٹھے برگر اور چپس کھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کولڈ ڈرنکس تھے اور ایمبولینس میں میوزک بھی چل رہا تھا۔ ریحان کو یہ سب دیکھ کر شدید کوفت ہوئی۔ اسے ایک ہفتہ قبل گزرا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔

وہ حیران تھا کہ ہم کس طرح دوسروں کو دھوکہ دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اگلے دن صبح اس نے یہ واقعہ اڈے پر اپنے ڈرائیور دوستوں کو سنایا لیکن کسی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور بات ہنسی میں اڑ گئی۔

پندرہ دن بعد اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہوا۔ اس مرتبہ ایمبولینس میں گٹار بجانے کے ساتھ سگریٹ پیئے جا رہے تھے۔

ریحان ان مسلسل واقعات سے بجھا سا گیا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ انسان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قومیں کیسے ترقی کرتی ہیں اور کیسے زوال کا شکار ہو جاتی ہیں؟ اس کا خیال تھا کہ جب تک ہم اپنے معاشرے میں خدا خوفی اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کو فروغ نہیں دیں گے تب تک ہرگز آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ نوجوانوں کو یہ کیا ہو گیا ہے اور وہ یہ کیسے کام کرنے لگے ہیں؟ بہرحال ان تین واقعات سے وہ بہت دن سوچوں میں مبتلا رہا۔

ایک ڈیڑھ ماہ بعد کی بات ہے کہ ریحان کو کچھ گھریلو سامان لوڈ کر کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچانے کا آرڈر ملا۔ اس آرڈر کا معاوضہ بھی اچھا طے ہو گیا تھا، اس لیے ریحان بڑی چستی سے سامان لوڈ کیے مین روڈ سے اسٹیشن کی طرف رواں دواں تھا۔ جب وہ بینک چوک سے ذرا آگے نکلا تو سڑک پر کسی ایمبولینس کا سائرن بجنا شروع ہوا۔ ریحان ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ اور فراڈ ہے بلکہ لوگوں کو تنگ کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے وہ لاپروائی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ شاید دوسری گاڑیوں والوں نے بھی یہی سوچ لیا اور ایمبولینس کو راستہ دینے کی بجائے اپنی منزل پر پہنچنا ضروری سمجھا۔

جب کوئی ایمبولینس سڑک کے بیچ سے نکلتی ہے تو اس کے بعد گاڑیوں کی دھکم پیل میں راستہ پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر ڈرائیور نے یہ سوچ لیا کہ راستہ دینے کے چکر میں کہیں وہ لیٹ نہ ہو جائے اور جہاں تک ریحان کی بات تھی، وہ کئی مرتبہ راستہ دینے کی نیکی بھگت چکا تھا۔

چناں چہ ایمبولینس کو راستہ نہ ملا اور سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں رہی۔

اسٹیشن سے واپسی پر ریحان نے ملت اسپتال کے گیٹ پر لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ اس نے ٹرک ایک سائیڈ پر پارک کیا اور بات کا پتا چلانے کے لیے لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ سامنے ایک نوجوان کی خون میں لت پت لاش رکھی ہوئی تھی۔ لاش کے اوپر سفید کپڑا ڈال دیا گیا تھا جو خون کے اثر سے سرخ ہو گیا تھا۔ قریب ہی اس کے بوڑھے ماں باپ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ذرا فاصلے پر وہی ایمبولینس کھڑی تھی جسے کسی نے بھی راستہ نہ دیا تھا۔

نوجوان کا اسپتال پہنچنا ضروری تھا، وقت پر ایسا نہ ہو سکا جس کی وجہ سے نوجوان اپنی زندگی کی بازی ہار گیا۔ ریحان سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ وہ وہاں سے بوجھل دل کے ساتھ واپس ہوا اور سوچنے لگا کہ نوجوان کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سارے واقعے میں قصور کس کا تھا اور ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟

☆☆☆

آیئے! آج ہم آپ کو چند ایسے مہربانوں سے ملواتے ہیں جو نہ صرف ہم پر بلکہ معاشرے پر بھی مہربانیاں کرتے ہیں۔

ان سے ملیے یہ ہیں ڈاکٹر جن کی کثیر تعداد ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت ہر گلی کے موڑ پر کلینک کی موجودگی ہے۔

اگر کسی بچے سے پوچھیں کہ آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے تو توقع کے مطابق یہی جواب ملتا ہے۔ ''ڈاکٹر بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔''

لیکن جوں ہی یہ بچہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنتا ہے تو ملک و قوم اور دکھی انسانیت کی خدمت کرنے کے بجائے کارکوٹھی کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ ایک اور مہربان ہیں کمیٹی والے جو کہ بہت ہی زیادہ صفائی پسند ہوتے ہیں۔ ان کے گھر تو شیشے کی طرح چمک رہے ہوتے ہیں جب کہ شہر کے گلی کوچوں میں کوڑے کی ڈھیریاں جگہ جگہ پڑی ہوتی ہیں۔ سونے پر سہاگہ کوڑے کرکٹ پر خوب صورت مکھیاں اور مچھر ہوتے ہیں جو کئی طریقوں سے ڈاکٹروں کو مریض مہیا کرتے ہیں۔

خیر صفائی کے معاملے میں ہم پھر بھی خوش قسمت نکلے۔ جیسے چودھویں کا چاند ایک ماہ بعد اپنی شکل دکھاتا ہے، بالکل اسی طرح گلی کا جمعدار اپنی شکل دکھاتا ہے، وہ بھی اس خوف سے کہ بڑے افسران چیکنگ کرنے آ رہے ہیں۔ چلیں، جمعدار پھر بھی چودھویں کا چاند بن جاتا ہے مگر افسران تو کچھ بھی نہیں سنتے۔

ارے ہاں! ایک اور مہربان سے تو آپ کی ملاقات کروائی ہی نہیں۔ یہ ہیں گٹر کے ڈھکن چور، جن کی مہربانیوں سے کئی بچے بڑے، مفت میں گٹر کی سیر کر چکے ہیں لیکن ہم پھر بھی داد دیتے ہیں ان کی ہمت اور طاقت کی۔ اِدھر گٹر پر ڈھکن رکھا گیا اُدھر غائب۔

ایک اور مہربان ہیں پانی والے۔ سارا سال نلکوں سے عجیب و غریب گیسیں نکلتی رہتی ہیں۔ اگر ان نئی نئی گیسوں پر کوئی سائنس دان تحقیق کرے تو اس کا نام پوری دُنیا میں روشن ہو سکتا ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ پانی آپ کو ملے نہ ملے، پانی کا بل ضرور ملے گا۔ بل پر درج شدہ رقم دیکھ کر آپ کے ہوش ضرور اُڑ جائیں گے لیکن ذرا سوچیے تو سہی آخر نل سے پانی نہیں ملتا تو کیا ہوا، گیس کی بدولت موسیقی تو سننے کو مل ہی جاتی ہے اور یہ بل اسی موسیقی کا ہے۔

ہمارے سب سے بڑے مہربان جن کا ذکر ہم بہت ضروری سمجھتے ہیں، وہ ہیں فقیر۔ اگر آپ کے گھر کے دروازے پر اطلاعی گھنٹی نہیں تو دروازہ اتنی زور زور سے کھٹکھٹاتے ہیں کہ لگتا ہے دروازہ آج سلامت نہیں رہے گا۔ آپ آرام کر رہے ہوں یا

ضروری کام دروازے پر ضرور آنا ہوگا اور کچھ دے دلا کر ہی فقیر کو رخصت کرنا ہوگا۔

ان فقیروں کی مہربانیوں کی بدولت ہم اکثر اپنے رشتہ داروں کو فقیر سمجھ لیتے ہیں اور ''بابا معاف کرو'' کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کبھی فقیروں کو رشتہ دار سمجھ لیتے ہیں۔

ان مہربانوں سے بھی ضرور ملیے۔ یہ ہیں غبارے والے، قلفیوں والے اور گول گپے والے۔

یہ مہربان ہمیشہ اس وقت آتے ہیں جب سورج عین درمیان میں ہوتا ہے اور اتنے سریلے سر بکھیرتے ہیں کہ ہر کوئی خود بخود نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اگر تھوڑی بہت کسر باقی رہ جائے تو اسے بچے پوری کر دیتے ہیں۔ یہ چیزیں کھانے کے بعد بھی ماشاء اللہ بہت سریلے سُر بکھیرتا ہے۔

ایک اور مہربان ہیں ایل ڈی اے والے ہیں۔ ایک دن سڑک بنا رہے ہوتے ہیں تو دوسرے دن بگاڑ رہے ہوتے ہیں۔ پھر سڑک ٹوٹتی ہے تو بننے کا نام نہیں لیتی۔ ان کی مہربانیوں سے برسات کے دنوں میں سڑک پر اچھی خاصی جھیل بن جاتی ہے۔ بچے اس پانی میں کشتیاں بنا بنا کر اپنی صحت بگاڑتے ہیں اور کئی سڑک پر گزرنے والے مفت میں جھیل کی سیر کرتے ہیں اور جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔

آج کل شجرکاری کی مہم چل رہی ہے مگر توبہ کریں جی جو ہمارے محلے میں کوئی پودا اپنی منزل کو پہنچا ہو۔ اس سلسلہ میں ہم ان کا نام لینا پسند نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے وہ ناراض ہو جائیں۔ شاید انہیں پودے پسند نہیں، اس لیے وہ انہیں ایسے غائب کرتے ہیں کہ زمین پر ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا۔

ہمارے ایک مہربان ہیں شاکر صاحب۔ نہایت شاکر، صابر جو چیز بھی ادھار مانگتے ہیں ہم اس چیز کی دعائے مغفرت مانگ لیتے ہیں۔

جب یہ نئے نئے آئے تھے۔ اس وقت چھت پر مالک مکان کا لوہے کے پلنگ کا پنجرہ پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے بھی نہیں بخشا۔ وہ دوسرے دن رَدّی فروش کے بورے میں تھا۔

ایک اوپر والے ہمارے ہمسائے مہربان ہیں۔ غالباً ان کا کچن گلی کی طرف ہے۔ لہٰذا اکثر اوقات انڈوں کے چھلکے، سبزی کا کوڑا وغیرہ کچن کی کھڑکی سے ہی باہر کی گلی میں پھینکا جاتا ہے اور یہ کوڑا کرکٹ گلی سے گزرنے والوں کو سلام کر کے زمین کو سدھارتا ہے۔

غرض یہ کہ ہمارے اتنے مہربان ہیں کہ ان سب کی خصوصیات لکھنے بیٹھیں تو صفحات ختم ہو جائیں، قلم کی سیاہی کم پڑ جائے لیکن ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں سب کے سب ہم پر یلغار نہ کر دیں۔ اس لیے ہم یہیں اس قصے کو ختم کرتے ہیں۔

تربیلا بند

یہ ایک عظیم الشان بند ہے جو تربیلا (ضلع ہزارہ، صوبہ کے پی کے) کے مقام پر دریائے سندھ کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ پاکستان کے منگلا بند سے دوگنا، مصر کے اسوان بند سے تین گنا مٹی کی بھرائی کا بڑا بند ہے۔

1952ء میں حکومتِ پاکستان نے اس بند کی تعمیر کا فیصلہ کیا اور عالمی بینک اور دوست ملکوں سے مالی وفنی امداد کی اپیل کی۔ 1968ء میں فرانس، اٹلی، برطانیہ، کینیڈا اور عالمی بینک نے اس منصوبے کے لیے قرضے منظور کیے اور اسی سال تین اطالوی اور تین فرانسیسی کمپنیوں کو بند کی تعمیر کا ٹھیکا دیا گیا۔ 1969ء میں اس کام میں جرمنی اور سوئٹزر لینڈ کی سات کمپنیاں بھی شامل ہوگئیں۔

نومبر 1971ء میں یہ بند مکمل ہوا اور 1977ء میں اس نے کام شروع کر دیا۔ اس بند کی لمبائی 9 ہزار فٹ اور اونچائی 469 فٹ ہے۔ پانی کا ذخیرہ 80 کلومیٹر لمبا ہے۔ اس میں دریا کے کنارے چار سرنگیں ہیں۔ تین سرنگوں پر بجلی گھر بنائے گئے ہیں جن سے راولپنڈی اور اسلام آباد کو بجلی مہیا کی جاتی ہے۔ چوتھی سرنگ آب پاشی کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس سے لاکھوں ایکڑ اراضی سیراب ہوتی ہے۔ اس سے راولپنڈی اور اسلام آباد کو پینے کا پانی بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ اس بند پر تقریباً 10,920 ملین (دس ارب بانوے کروڑ) روپیہ صرف ہوا۔

چاروں طرف گہری خاموشی اور سناٹا تھا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس مصیبت سے کیسے باہر نکلیں گے۔ اندھیرے میں اس نے غور سے آس پاس دیکھا۔ وہاں انہیں کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے اپنی ساتھی سے پوچھا۔
''ہمیں یہاں کون لایا تھا؟''
اس کی ساتھی جولی نے سرگوشی میں کہا۔
''جو کوئی بھی ہمیں یہاں لایا تھا اس نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے، مگر اب ہمیں ہر حالت میں یہاں سے باہر نکلنا ہے، مگر خدا کے لیے آواز مت نکالو۔ بات مت کرو۔ اب ہم صرف اشاروں سے بات کریں گے۔''
کیٹی نے سر ہلا کر اشارہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔
جولی سانگ نے ملوخ بت کی انتڑیوں کو غور سے دیکھا۔ یہ اسے بہت بڑے بڑے پرنالے معلوم ہو رہے تھے جو اِدھر سے اُدھر چلے گئے تھے۔ جولی سانگ نے اوپر ایک سوراخ کی طرف اشارہ کیا۔ کیٹی نے بھی اس سوراخ کو دیکھا۔ اس سوراخ میں سے سبز رنگ کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ جولی سانگ نے اپنے کان پر انگلی رکھ کر اشارے میں بتایا کہ یہ اس بت کا کان ہے اور ہمیں اس کان میں سے باہر نکلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

جولی سانگ نے پتھر کی انتڑیوں پر چڑھ کر اوپر کی طرف لپکنا شروع کر دیا۔ ملوخ بت خلائی لہروں کی توانائی کے نشے میں مدہوش تھا۔ اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ اس کے پیٹ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ جولی سانگ کے پیچھے پیچھے کیٹی بھی بت کی انتڑیوں پر رینگ رینگ کر اوپر چڑھ رہی تھی۔ آگے بت کے پھیپھڑے آگئے۔ یہ بھی پتھر کے تھے اور بہت بڑے غبارے کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ جولی سانگ آگے بڑھتے ہوئے کیٹی کو اشارے کرتی جا رہی تھی۔ کیٹی ان اشاروں کی مدد سے جولی سانگ کے پیچھے پیچھے رینگ رہی تھی۔ انتڑیوں پر سے ہوتی ہوئی جولی سانگ ملوخ بت کے سنگین پھیپھڑوں کے اوپر سے رینگ کر کان کے سوراخ کی طرف بڑھی۔ کیٹی اس کے پیچھے تھی۔ دونوں چھوٹے سے کیڑوں کی طرح لگ رہی تھیں جو کسی بڑے پتھر پر رینگتے جا رہے ہوں۔
جولی سانگ اور کیٹی کو ملوخ بت کے کان کے سوراخ تک پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ کان کا گول سوراخ انہیں ایک غار کے منہ کی طرح لگ رہا تھا جس میں سے ہال کمرے میں پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ کان کا سوراخ ان دونوں کو اس لیے بھی بڑا لگ رہا تھا کیوں کہ وہ خود بہت چھوٹی تھیں۔ سب سے پہلے جولی سانگ ملوخ بت کے کان میں سے باہر نکلی۔ اس کے ساتھ ہی کیٹی بھی باہر

آ گئی۔ وہ بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ انہوں نے نیچے دیکھا تو انہیں ایسا لگا جیسے وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی ہیں۔ وہ اب بھی بول نہیں رہی تھیں۔ جولی سانگ نے اشارہ کیا کہ ہم بت کے پیچھے سے رینگ کر نیچے جائیں گے۔

چناں چہ وہ ملوخ بت کے پیچھے آ گئیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے پتھر باہر کو ابھرے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ان پتھروں کو پکڑتیں، پاؤں رکھتی نیچے اتر آئیں۔ زمین پر آتے ہی وہ دیوار کے ساتھ لگ کر ہال کمرے کے دروازے کی طرف دوڑنے لگیں۔ ان کی رفتار کسی چوہے سے بھی کم تھی۔ انہیں ملوخ بت کے ہال کمرے سے نکلتے ہوئے دس منٹ لگ گئے۔ ملوخ بت ابھی تک مدہوش تھا کیوں کہ اس کے سارے جسم میں خلائی توانائی ابھی اتنی بھری ہوئی تھی کہ وہ ایک گھنٹے تک مدہوش رہ سکتا تھا۔ اسی مدہوشی کے لیے ملوخ بت نے گارشن کو کہا تھا کہ وہ اس کے لیے دو خلائی عورتیں تلاش کر کے لائے۔

جولی سانگ اور کیتی ہال کمرے سے باہر سرنگ میں آ گئیں۔ یہاں اگرچہ اندھیرا تھا مگر خلائی مخلوق ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اندھیرے میں بھی اچھی طرح سے دیکھ رہی تھیں۔ جولی سانگ سرنگ میں آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ کیتی اس کے پیچھے تھی۔ جب وہ کافی دور تک دوڑتی گئیں تو تھک گئیں اور دیوار کے ساتھ لگ کر ہانپنے لگیں۔ ذرا سانس درست ہوا تو کیتی نے کہا۔

''جولی! اس سرنگ سے نکلنے کا ایک راستہ ہے جو ایک کنوئیں میں سے اوپر جاتا ہے۔ نقلی عنبر مجھے وہیں سے یہاں لایا تھا۔''

جولی سانگ نے باریک آواز میں جواب دیا۔

''لیکن کیتی، ہمیں پُراسرار کوٹھڑی میں جو صندوقچی ہے، وہاں سے لال موتی بھی اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس موتی کی مدد سے تھیو سانگ اچھا ہو جائے گا اور مجھے وہ موتی دلہن کی لاش کو جا کر دینا ہے۔ دلہن کی لاش نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اسے لال موتی لا دوں تو وہ میرا سوال پورا کر دے گی۔ اب یہاں آئے ہیں تو ہمیں لال موتی لے کر ہی چلنا ہوگا۔''

کیتی بولی۔ ''یہ تم نے ٹھیک کہا ہے جولی سانگ! مجھے اس غار کا راستہ آتا ہے جہاں لال موتی والی کوٹھڑی ہے۔''

جولی سانگ بولی۔ ''وہ جگہ میں نے بھی دیکھی ہے۔ اس نقلی عنبر نے ہمیں اسی جگہ لے جا کر چھوٹا کیا تھا اور پھر اس منحوس بت کے پیٹ میں ڈال دیا تھا۔''

کیتی آہستہ سے کہنے لگی۔

''وہ نقلی عنبر جادوگر کہیں ہماری باتیں نہ سن رہا ہو۔''

جولی نے کہا۔ ''سنتا ہے تو سنتا رہے۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔''

جولی سانگ جوں ہی وہاں سے چلنے لگی، اس کا ہاتھ دیوار میں سے باہر کو نکلی ہوئی کھوپڑی کو چھو گیا۔ جولی سانگ وہیں رک گئی۔ اس نے کیتی کو بھی روک لیا اور کہا۔

''کیتی! یہ کسی مردے کی کھوپڑی ہے، کیوں نہ اس سے مشورہ کیا جائے۔ یہ اسی زمین دوز دنیا کا مردہ ہے۔''

کیتی بولی۔ ''کوشش کر کے دیکھو۔''

جولی سانگ نے دیوار میں سے ذرا باہر کو نکلی ہوئی کھوپڑی کے ساتھ اپنی انگلی لگا دی اور آہستہ سے کہا۔

''اے مردے کی کھوپڑی! کیا تو مجھ سے بات کرے گا؟'' کھوپڑی کی دھیمی خشک آواز آئی۔

''کیا بات ہے جولی! میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔''

جولی سانگ نے کہا۔ ''کیا تم ہم دونوں کو پھر سے بڑا کر سکتے ہو۔'' مردے کی کھوپڑی کی آواز آئی۔

''جولی سانگ! میرے پاس یہ طاقت نہیں ہے لیکن میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ یہاں سے تھوڑی دور ساتھ والی غار میں ایک کوٹھڑی ہے۔ اس کوٹھڑی میں ایک صندوقچی ہے۔''

جولی سانگ بولی۔ ''ہاں! میں نے وہ صندوقچی دیکھی ہے۔ اسی کے کھولنے سے تو ہم چھوٹی ہو گئی تھیں۔''

کھوپڑی نے کہا۔ ''پھر اس کے دوبارہ کھولنے سے تم دوبارہ بڑی ہو جاؤ گی۔''

جولی سانگ نے کہا۔

''وہ جادوگر کہاں ہے جس نے ہمیں دھوکے سے یہاں لا کر بت کے پیٹ میں ڈال دیا تھا۔ کہیں وہ ہمارے مقابلے پر تو نہیں آ جائے گا۔''

کھوپڑی نے کہا۔ ''وہ جادوگر گارشی تھا۔ وہ مر چکا ہے۔ ملوخ دیوتا نے اسے ہلاک کر ڈالا ہے۔''
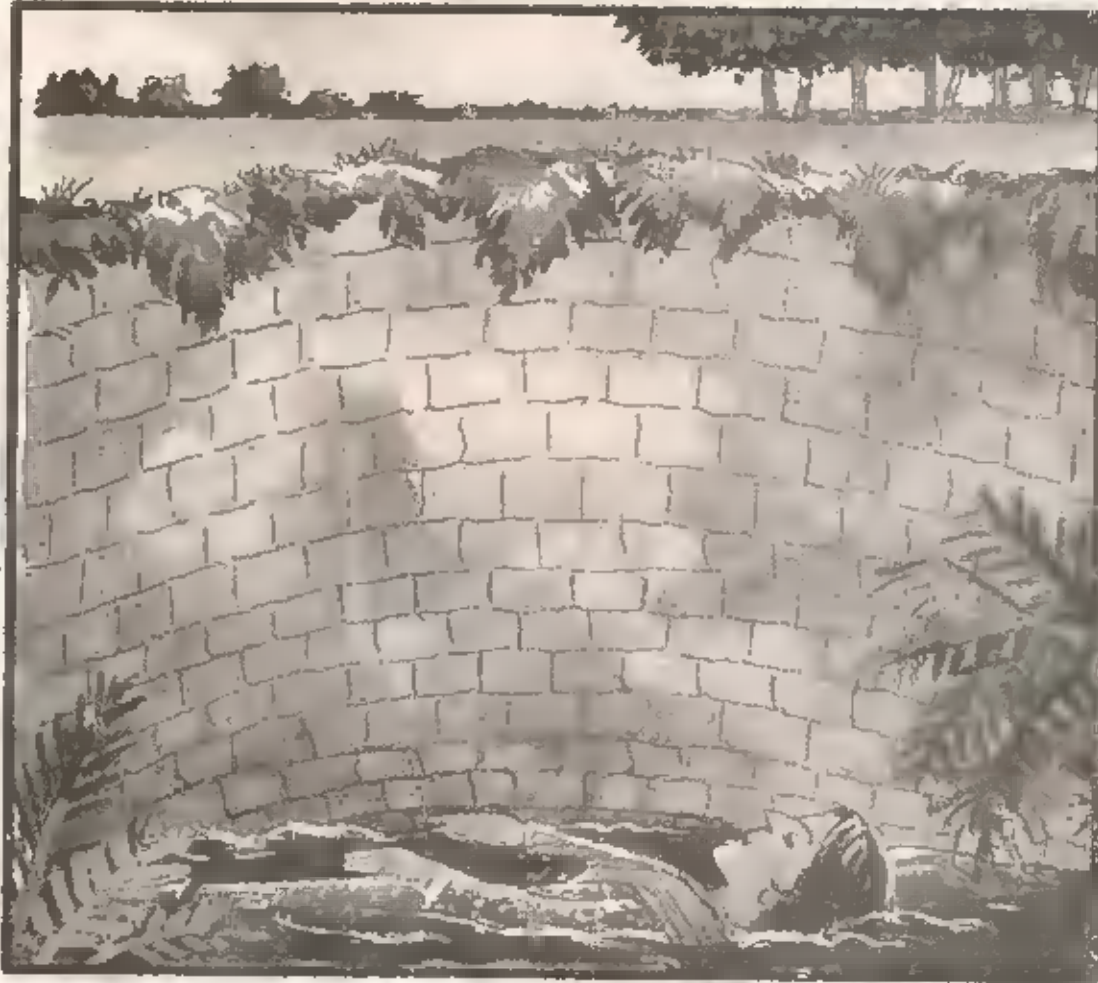
جولی سانگ اور کیٹی کو بڑی خوشی ہوئی۔ کیٹی نے اپنی باریک آواز میں پوچھا۔
"کہیں دیوتا ملوخ ہمیں بھی تو ہلاک نہیں کر ڈالے گا۔"
کھوپڑی نے کہا۔ "نہیں، وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ شاید وہ رات بھر سوتا رہے گا۔ تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔"
جولی سانگ نے کھوپڑی کا شکریہ ادا کیا اور کیٹی کو لے کر پُراسرار کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔ اندھیرے غار میں راستہ تلاش کرتے اور آہستہ آہستہ چلنے کی وجہ سے انہیں کافی دیر لگ گئی۔ آخر وہ اس غار میں پہنچ گئیں۔ جہاں غار آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ دیوار کے ساتھ لٹکتا ہوا کنڈا دیکھ کر کیٹی نے کہا۔
"یہی وہ کنڈا ہے جس کو کھینچنے سے کوٹھڑی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔"
جولی سانگ نے کہا۔ "کنڈا ہم سے کافی اونچا ہے۔ اس کو کس طرح سے کھینچیں۔"
کیٹی بولی۔ "میں تمہارے کندھوں پر کھڑی ہو کر اس کو کھینچنے کی کوشش کرتی ہوں۔"
فوراً جولی سانگ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کیٹی اس کے کاندھوں پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی مگر کنڈا اب بھی اس سے دو تین فٹ بلند تھا۔ جولی سانگ نے نیچے سے آواز دی۔
"کیٹی! اُچھل کر کنڈے کو پکڑ لو۔"
کیٹی نے ایسا ہی کیا۔ وہ اُچھلی اور اس کا ہاتھ کنڈے پر جا پڑا اور وہ کنڈے کے ساتھ لٹکنے لگی۔ اس کے بوجھ سے کنڈا نیچے ہو گیا اور فوراً دیوار میں ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ شگاف پڑ گیا۔ یہ شگاف ایک چھوٹے سے دروازے کی شکل کا تھا۔ جولی سانگ اور کیٹی اندر داخل ہو گئیں۔ کوٹھڑی میں ہلکی سبز روشنی تھی اور درمیان میں پتھر پر صندوقچی پڑی تھی۔ کیٹی نے کہا۔
"یہی وہ صندوقچی ہے جولی۔"
دونوں چوں کہ چھوٹی تھیں اس لیے صندوقچی انہیں ایک بہت بڑے صندوق کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کا طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ اب کیٹی صندوقچی کے کنڈے کے نیچے کھڑی ہو گئی اور جولی سانگ اس کے کندھوں پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور صندوقچی کے کنڈے کو کھول دیا۔ پھر پوری طاقت خرچ کر کے صندوقچی کے ڈھکن کو پیچھے پھینک دیا۔ صندوقچی کے کھلتے ہی اس میں سے کالے رنگ کا دھواں بادل کی طرح نکلا اور اس دھوئیں کے بادل نے کیٹی اور جولی سانگ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب دھواں ہٹا تو جولی سانگ اور کیٹی دونوں بڑی ہو چکی تھیں۔
انہوں نے اپنے پورے سائز کے جسم کو دیکھا تو بے حد خوش ہوئیں۔ جولی سانگ نے صندوقچی میں جھانکا۔ اس کے اندر سرخ رنگ کا ایک موتی پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے اُٹھا لیا اور جیب میں رکھتے ہوئے کیٹی سے کہا۔
"لال موتی میں نے اُٹھا لیا ہے۔ اب فوراً یہاں سے بھاگو اور وہ راستہ تلاش کرو جو کنوئیں میں سے ہو کر اوپر شہر کے جنگل میں جا

نکلتا ہے۔"

اب وہ بڑی ہوگئیں تھیں اور تیز تیز چل سکتی تھیں۔ کیٹی نے غار میں دوڑنا شروع کر دیا۔ دونوں نے دوڑتے ہوئے غار کو پار کیا۔ اس کے آگے ایک چھوٹی سی اندھیری سرنگ۔ دائیں طرف کو جاتی تھی۔ کیٹی نے اس موڑ کو پہچان لیا اور بولی۔

"یہی سرنگ کنوئیں کو جاتی ہے جولی۔"

"تو پھر چلو۔"

اور انہوں نے اس تنگ و تاریک سرنگ میں بھاگنا شروع کر دیا۔ دوڑتے دوڑتے آخر وہ کنوئیں میں آ گئیں۔ یہاں پتھر کا زینہ اوپر کنوئیں کے منہ تک جاتا تھا۔ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر کنوئیں کے منہ تک آ گئیں۔ کنوئیں کا منہ پتھر کی بھاری سل سے بند تھا لیکن اب جولی سانگ اور کیٹی بڑی تھیں اور ان کے پاس ان کی طاقت موجود تھی۔ انہوں نے پتھر کی سل کو پرے ہٹا دیا اور کنوئیں سے باہر نکل آئیں۔

جنگل میں شام ہو رہی تھی۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا میں آ کر انہیں بڑی خوشی محسوس ہوئی۔ کیٹی نے کہا۔

"لال موتی ایک بار پھر دیکھ لو۔"

جولی سانگ نے موتی کو جیب سے نکال کر دیکھا۔ جب اس کی تسلی ہوگئی کہ لال موتی اس کے پاس موجود ہے تو انہوں نے پتھر کی سل سے کنوئیں کا منہ دوبارہ بند کر دیا اور شہر کی اس سرائے کی طرف چلیں جہاں بوڑھا تھیو سانگ ان کے انتظار میں بے حد پریشان بیٹھا تھا۔ جولی سانگ اور کیٹی کی اسے پہلے ہی خوشبو آ گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ جولی سانگ اور کیٹی نے جب اسے بتایا کہ جو عنبر وہاں سرائے میں آیا تھا وہ نقلی عنبر تھا تو تھیو سانگ بولا۔

"میرا دل پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ اس کے جسم سے عنبر کی خوشبو بھی نہیں آ رہی تھی۔ کیا تم لال موتی لائی ہو۔"

جولی سانگ نے اسے لال موتی دکھایا تو تھیو سانگ اپنا بوڑھا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اب جلدی سے اس لال موتی کو دلہن کی لاش کے پاس لے جاؤ تاکہ مجھے بھی اس بڑھاپے سے نجات ملے۔ میں تو سخت کمزور ہوگیا ہوں۔"

جولی سانگ نے اسے تسلی دی اور کہا۔

"اب تم دونوں یہاں اطمینان سے بیٹھو۔ میں دلہن کی لاش کے پاس جاتی ہوں۔"

کیٹی کہنے لگی۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی جادوگر تمہاری یا ناگ ماریا کی شکل بدل کر ہمارے پاس آ جائے۔"

جولی سانگ بولی۔ "اگر کوئی نقلی ناگ ماریا آ بھی گئے تو یہ یاد رکھنا کہ ان کے ساتھ تمہیں کہیں نہیں جانا ہوگا بلکہ میرے آنے تک ان کو بھی اسی جگہ بٹھائے رکھنا۔ اول تو اب کوئی نقلی عنبر ناگ نہیں آئے گا۔ وہ جادوگر مر چکا ہے جس نے عنبر کا روپ بدلا تھا۔"

یہ کہہ کر جولی سانگ دلہن کی لاش والی باؤلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

دو دن اور ایک رات کے سفر کے بعد جولی سانگ کیلاش مندر کی باؤلی میں پہنچ گئی۔ اس وقت ابھی آدھی رات نہیں ہوئی تھی اور باؤلی میں دلہن کی لاش آدھی رات کو پانی کی سطح پر آتی تھی۔

جولی سانگ باؤلی کے باہر بیٹھ گئی اور آدھی رات کا انتظار کرنے لگی۔ جب آدھی رات گزر گئی تو جولی سانگ پتھر کا زینہ اترنے کے بعد اندھیرے میں باؤلی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد پانی کی تاریک سطح پر بلبلے اٹھنے لگے۔ دلہن کی لاش نیچے سے آ رہی تھی اور پھر دلہن کی لاش پانی کی سطح پر آ گئی۔ اس نے اسی طرح سونے کے گہنے پہن رکھے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کھلی تھیں۔ پانی کی سطح پر آتے ہی دلہن کی لاش نے آواز دی۔ "کیا تم نے میرا سوال پورا کر دیا ہے؟"

جولی سانگ نے کہا۔ "ہاں اے دلہن! میں تمہارا لال موتی لے آئی ہوں۔"

دلہن کی لاش پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی جولی سانگ کے قریب آ گئی۔ لاش نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جولی سانگ نے لال موتی اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دلہن کی لاش نے لال موتی کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور بولی۔

"تو نے میرا سوال پورا کیا۔ میں نے تیرے دل کی مراد پوری کر دی ہے۔ جاؤ جو تم چاہتی ہو وہ ہو گیا ہے۔"

جولی سانگ نے پوچھا۔

کیا میرا بھائی تھیو سانگ پھر سے جوان ہو گیا ہے؟ کیا اسے غیر قدرتی بڑھاپے سے نجات مل گئی ہے؟ (باقی آئندہ) ☆☆

ہفت روزہ تکبیر کے بانی و مدیر محمد صلاح الدین شہید نے ایک بار کہا تھا: "انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ٹولی سے کوئی فرد بچھڑ کر ہمارے عہد میں ہمارے درمیان آ گیا ہے۔"

یہ تذکرہ ایک ایسی شخصیت کا ہے جس نے اپنی زندگی کا طویل حصہ اسلامی تحقیق اور سیرت نبوی ﷺ کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں گزارے۔ یہ شخصیت ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی ہے جو عالم اسلام کے عظیم محقق، قرآن مجید کے فارسی مترجم اور کئی اسلامی کتابوں کے مصنف کے حوالے سے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ 19 فروری 1908ء میں ایک علمی و ادبی مرتبے والی شخصیت ابو محمد خلیل اللہ کے گھر حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ والد بیٹے کو خود درس دیتے رہے۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن کی مشہور درس گاہ دارالعلوم میں داخل کرایا۔ یہاں سے 1923ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد برصغیر کی پہلی اردو یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اسلامیات کے طالب علم بنے۔ وہ وقت کے پابند اور حاضر باش طالب علم تھے۔ کبھی غیر حاضر نہیں رہے، ہاں البتہ ایک بار آدھا گھنٹہ تاخیر سے کلاس میں داخل ہوئے، وجہ یہ تھی کہ اس دن ان کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔

1930ء میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے فقہ میں ایم اے کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قانون کے امتحان میں کام یاب ٹھہرے۔ ان دونوں امتحانات میں وہ اوّل درجے میں کام یاب ہوئے۔ اسی سال وہ جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ اسکالر بن گئے۔ اپنے علمی کام کے سلسلے میں جرمنی اور فرانس گئے اور پی ایچ ڈی کی دو عدد ڈگریاں حاصل کیں۔ واپس آ کر پی ایچ ڈی کی تیسری ڈگری جامعہ عثمانیہ سے لی۔ ان دنوں وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ قانون سے منسلک تھے۔ یہاں ایل ایل ایم کی کلاسوں کا آغاز ہوا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب بھی پڑھاتے تھے۔ پہلے دن یونیورسٹی کی بس میں سوار ہوئے تو ان سے پہلے اسی بس میں چار پانچ طالب علم بھی سوار تھے۔ ڈاکٹر صاحب اندر آ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کنڈکٹر نے پہلے آ کر ان سے ہی کرایہ لیا تو انہوں نے اپنے سمیت دوسرے طالب علموں کا بھی کرایہ ادا کر دیا۔ پھر تو یہ معمول بن گیا کہ ڈاکٹر صاحب بس میں موجود طالب علموں کا کرایہ بھی اپنی جیب سے ادا کرتے۔ بس میں طالب علموں کی تعداد بڑھتی گئی مگر ڈاکٹر صاحب کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔

1947ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو حیدر آباد دکن نے بھی اپنے مخصوص حالات میں اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ستمبر 1948ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے ساتھ ہی بھارت نے ستر مختلف مقامات سے حیدر آباد دکن پر حملہ کر دیا۔ حیدر آباد کی آزادی کی حفاظت کے لیے حیدر آباد سے ایک وفد بھارت کی جارحیت کا مقدمہ پیش کرنے کے لیے سلامتی کونسل گیا۔ اس میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کا وفد بھی شامل تھا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھی تھے۔

حیدر آباد کا مقدمہ پیش کر کے وہ پیرس اترے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ دوستوں نے کہا کہ حیدر آباد دکن واپس آ جائیے، مگر جس وطن کی آزاد باہوں میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی، اب اس کو غلام دیکھ کر ان کا دل کڑھتا تھا، اس لیے وہاں زندگی بھر نہیں گئے۔ دوستوں نے پاکستان آنے کی دعوت دی مگر ان کی طبیعت نہ مانی، مگر جب بھی حکومت پاکستان نے کسی علمی خدمت کے لیے دعوت دی، وہ سارے کام چھوڑ کر آئے اور کام ختم کر کے فوراً ہی دوبارہ واپس پیرس جا کر علمی کام میں مصروف ہو گئے۔

پہلی بار وہ پاکستان قرارداد مقاصد کی تیاری اور شرعی قوانین کے نفاذ کے بارے میں پاکستان کے ابتدائی سالوں میں آئے تھے۔ سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرنے کے بجائے اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے۔ حکومت سے کھانے پینے کی کوئی سہولت نہ لی اور

نہ ہی مشاہرہ لینا پسند کیا۔ یہاں تک کہ اجلاس میں شرکت کے لیے بھی روزانہ قیام گاہ سے پیدل ہی جاتے اور کبھی تاخیر نہیں ہوئی۔ جب کچھ نقد پیش کرنے کی بات ہوئی تو قلندرانہ شان و شوکت سے جواب دیا: "میں تو پاکستان کی خدمت کے لیے آیا ہوں۔"

وہ نو زبانوں سے واقف تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، اطالوی، فرانسیسی، روسی اور جرمنی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔

وہ زندگی بھر اسوۂ حسنہ کا ہر دم اور ہر لمحے خیال کرتے رہے۔ ہمیشہ باتیں کم ہی کرتے۔ کوئی ضروری بات ہوتی تو کہہ دیتے، ورنہ خاموش ہی رہتے۔ بات انتہائی بااخلاق انداز میں کرتے کہ سامنے والا گرویدہ ہو جاتا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے 1980ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں بارہ مختلف موضوعات پر لیکچر دیے جو بعد میں خطبات بہاول پور کے نام سے کتابی صورت میں آئے۔ انہوں نے زندگی بھر علمی کاموں کا معاوضہ نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے حقوقِ اشاعت "عام" ہیں۔ انہیں ہر کوئی شائع کر سکتا ہے۔ سعودی عرب نے جب شاہ فیصل ایوارڈ کا اجرا کیا تو ان کی اسلام کے فروغ کے لیے تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات سرانجام دینے پر انہیں ایوارڈ اور بڑی رقم دینے کی پیش کش ہوئی، مگر انہوں نے درویشانہ انداز میں معذرت کر لی۔ حکومتِ پاکستان نے نئی صدی ہجری کے آغاز پر ہجرہ ایوارڈ دینا چاہا تو یہاں بھی معذرت تھی۔ ضد کرنے پر ایوارڈ تو لے لیا مگر اس کے ساتھ ملنے والی بڑی رقم اسلامی یونیورسٹی کے نام کر دی۔

ان کے معمولات میں تھا کہ وہ صبح اُٹھ کر پیرس کی علمی لائبریریوں میں نکل جاتے اور پھر سارا دن کتابیں ہی ان کی رفیق ہوتیں۔ رات کو عشاء کے بعد گھر آتے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے احادیث نبویؐ کی تحقیق اور سیرۃ النبیؐ کے باب میں گراں قدر کام کیا ہے۔ ان کی زندگی کے معمولات کا تعارف کراتے ہوئے معروف مقرر شاہ بلیغ الدین ایک جگہ لکھتے ہیں: "وظیفہ کا پیسہ بچا کر ڈاکٹر صاحب کتابوں کی خریداری میں لگاتے۔ بسا اوقات تو ٹرام یا بس کا خرچہ بھی بچا کر پیدل ہی کتب خانے یا یونیورسٹی جاتے تھے۔ انہیں بننے سنورنے یا عمدہ کپڑے پہننے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شیروانی پہنے نظر آتے اور سر پر ترکی ٹوپی کے بجائے جناح کیپ ہوتی۔ حیدر آباد اور پیرس، دونوں جگہ زندگی میں سادگی کی جھلک تھی۔ ملاقاتی ان کے کمرے میں ہی آ کر مل لیتے۔"

خط وہ کبھی شوقیہ نہ لکھتے تھے۔ تحفے کی ہمیشہ قدر کرتے تھے۔ حکیم محمد سعید شہید انہیں بڑی محبت سے باقاعدگی کے ساتھ ہمدرد نونہال، پیرس بھجوایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے پوسٹ کارڈ بھیجا جس میں تحریر تھا کہ "آپ ہمدرد نونہال نہ بھیجا کریں، اسے پڑھنے کے لیے کافی وقت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے دوسری علمی کام رہ جاتے ہیں۔" (یعنی وہ رسالے کو پڑھتے ضرور تھے، بعد میں دوسرے علمی کام کرتے تھے۔)

انہوں نے قرآن کے پیغام کو مختلف یورپی قوموں اور زبانوں میں منتقل کر کے اسے عام کیا اور لاتعداد غیر مسلموں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔ تصویر کھنچوانے کو وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ اپنی سوانح عمری لکھنے پر اصرار کرنے والوں کو جواب دیتے تھے کہ میں نے کوئی قابلِ ذکر کام تو کیا نہیں، کیا تحریر کروں۔ طبیعت میں بلا کی سادگی اور دوسروں کے ذاتی معاملات سے لاتعلقی تھی۔ ننگے سر کبھی نہ رہتے اور ہمیشہ باوضو رہتے۔ زندگی بھر فرانس کے شہر پیرس میں ایک پرانی عمارت کی تیسری منزل کے ایک کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ میں رہے اور فرانس کی شہریت سے بھی محروم رہے۔

آخری دنوں میں طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ان کی بھتیجی سدیدہ احمد انہیں اپنے ہمراہ امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر جیکسن ول لے گئیں، جہاں ان کا انتقال 17 دسمبر 2002ء کو نمازِ ظہر کے بعد ہوا۔ ☆☆

اوس کیا ہے؟
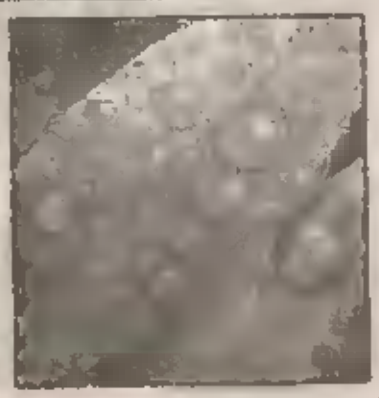
ہوا میں اگرچہ نمی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس میں چھوٹے چھوٹے نظر نہ آنے والے پانی کے بہت سے ذرّے موجود ہوتے ہیں۔ رات کو جب سورج چھپ جاتا ہے تو گھاس ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہوا میں موجود پانی کے ننھے ننھے ذرّے گھاس کے قریب آ جاتے ہیں اور وہ بھی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اور نیچے اترتے ہیں اور ان میں سے کچھ گھاس سے چمٹ جاتے ہیں۔ ان ذرّوں پر دوسرے ذرّے بھی گرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ سب مل کر ایک بڑا سا قطرہ بن جاتے ہیں۔ انہی قطروں کو شبنم یا اوس کہتے ہیں۔

رات کو آسمان پر بادل ہوں تو آپ صبح کو گھاس پر شبنم نہیں دیکھیں گے کیوں کہ بادل زمین کو کپڑے کی طرح ڈھانپ لیتے ہیں اور وہ اس کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتے۔ زمین سے جو حرارت نکلتی ہے، بادل اس کو واپس زمین کی طرف بھیج دیتے ہیں۔ چوں کہ گھاس ٹھنڈی نہیں ہوتی، اس لیے پانی کے ذرّے بھی ٹھنڈے ہو کر گھاس پر نہیں گرتے۔

بوتل

(محمد وقاص، جھنگ صدر)

"فرحان یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے تمہیں کتنی دفعہ بوتل سے منہ لگا کر پانی پینے سے منع کیا ہے۔" فرحان امی کی بات سن کر کمرے میں بھاگ گیا۔ فرحان بہت اچھا بچہ تھا۔ وہ ہمیشہ جماعت میں اوّل آتا تھا۔ وہ گھر والوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس کے والدین اس کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، مگر فرحان کی ایک عادت اس سے چھوٹ نہیں رہی تھی۔ وہ بوتل کو منہ لگا کر پانی پینے کی عادت تھی۔ وہ باہر ہوتا یا گھر میں ہمیشہ بوتل سے منہ لگا کر پانی پیتا۔ جب اس کے ماں باپ اس کو منع کرتے تو وہ کہتا کہ اس سب کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے ماں باپ اس کی عادت سے تنگ آ چکے تھے۔ ایک دفعہ فرحان کی امی نے بوتل میں پانی ڈالا تو اس کا ڈھکن غائب تھا۔ وہ ڈھکن ڈھونڈنے لگیں۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا کاکروچ بوتل میں رینگتا ہوا چلا گیا۔ فرحان کی امی نے بوتل کو ڈھکن لگایا اور بوتل کو ٹھنڈی ہونے کے لیے فریج میں رکھ دیا۔ ایک گھنٹے بعد فرحان حسب معمول کھیل کر واپس آیا تو اسے پیاس محسوس ہوئی۔ وہ کچن میں آیا اور بوتل نکالی۔ اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ وہ پانی پینے ہی لگا تھا کہ اس کے ابو نے اس سے بوتل چھین لی۔ اس نے ابو سے وجہ پوچھی تو اس کے باپ نے کہا۔ "بیٹا! آپ نے دیکھا بھی نہیں کہ بوتل میں کاکروچ ہے۔ اگر آپ خدا نخواستہ پانی پی لیتے تو......" یہ سن کر فرحان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اگر وہ پانی پی لیتا تو...... یہ سوچ کر اسے جھرجھری آ گئی۔ اس کے ابو نے کہا۔ "بیٹا! اسی لیے تو ہم آپ سے کہتے ہیں کہ پانی گلاس میں ڈال کر پیا کریں اور پیتے وقت ضرور اس چیز کو دیکھ لیا کریں۔ اس طرح اگر کوئی چیز پانی میں گر گئی ہو تو ہمیں پتا چل جاتا ہے۔" فرحان نے اپنے ابو سے وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ گلاس میں پانی پیئے گا۔ بچو! آپ بھی وعدہ کریں کہ ہمیشہ گلاس میں پانی پیا کریں گے۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

ننھا اُستاد

(رائحہ مریم، سیالکوٹ)

اس دن کالج سے واپسی پر بازار میں خاصا رش تھا۔ گاڑی بالکل آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رُک کر کھڑی بھی ہو جاتی تھی۔ میں نے بوریت کم کرنے کے لیے شیشے سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

میری نظر ایک بچے پر پڑی۔ وہ تقریباً آٹھ یا نو سال کا ہو گا۔ اس کے پتلے سے جسم پر پھٹے پُرانے کپڑے تھے، مگر اس کے چہرے پر کسی شکایت کی بجائے معصومیت کے تاثرات تھے۔ بازار میں ایک کریانہ دُکان تھی اور وہ بار بار اس دُکان کو دیکھے جا رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ میں تو نہ جان پائی مگر شاید دُکان کا مالک جان گیا۔ مالک نے اسے اشارہ کیا۔ وہ بچہ جب اس دُکان مالک کے پاس گیا تو اس نے بچے کو ایک بسکٹ کا پیکٹ دیا۔ وہ اسے بخوشی لے کر بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

اتنے میں میری گاڑی تھوڑی آگے بڑھی۔ بھیڑ ہونے کی وجہ سے رفتار آہستہ تھی، اس لیے میں اس بچے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ وہ بچہ بھی بسکٹ لے کر آگے بڑھنا شروع ہو گیا۔ اس بچے کی نظریں بسکٹ پر تھیں۔ بچہ بسکٹ کو ہر طرف سے اُلٹا کر دیکھ رہا تھا۔ شاید اس پر جو لکھا تھا وہ پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، تو یا پھر اس کے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

میری گاڑی اور وہ بچہ مسلسل آہستہ آہستہ ایک ہی سمت میں جا رہے تھے۔ اچانک اس بچے کی نظر ایک بھوکے کتے پر پڑی جو کہ بچے کے ہاتھ میں بسکٹ دیکھ کر اس کے سامنے مچل گیا۔ میں اب بڑے غور سے اس بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ایک نظر کتے پر ڈالتا اور ایک بسکٹ پر۔

پھر اس نے فیصلہ کر لیا، اس نے بسکٹ کا پیکٹ کھولا اور زیادہ بسکٹ اس کتے کو دیے اور ایک یا دو خود لے کر آگے چل دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس کے چہرے پر وہ مسرت دیکھی تھی جو کہ میں نے بہت کم لوگوں کے چہروں پر پائی

ہے اور یہ خوشی تب ہی ہوتی ہے جب انسان خود سے بڑھ کر دوسروں کا خیال رکھے۔ میری نظروں میں وہ بچہ ''ہیرو'' ہے کیوں کہ جب وہ وسائل کم ہونے کے باوجود کسی کی مدد کرنے سے نہیں کترایا تو پھر ہم؟..... ہم تو بہت بے حس لوگ ہیں جو آسائشیں ہونے کے باوجود کسی کی مدد نہیں کرتے۔ وہ بچہ میرا اُستاد ٹھہرا جس نے مجھے ایک عظیم سبق سکھایا۔ (دوسرا انعام:175 روپے کی کتب)

مصلحت

(حذیفہ ساجد، لاہور)

''ٹرن ٹرن ٹرن.....''

''ہیلو..... کیا.....؟'' ان الفاظ کے ساتھ ہی میری بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''کیا ہوا بیٹا؟'' میری امی نے میری بیوی سے دریافت کیا۔

''اماں جان! میرے بھائی نے جو دس لاکھ کا ٹرک لیا تھا، وہ ڈاکو چھین کر لے گئے، اس طرح انہیں پانچ لاکھ کا نقصان ہو گیا۔''

''بیٹا! ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔'' اماں جان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے ہاتھ ناشتہ کرتے ہوئے رُک گئے۔ یہ میری اماں کی عادت تھی جب بھی فائدے یا نقصان کی بات ہوتی تو اماں جان بولتیں:

''بیٹا! اس کام میں اللہ کی مصلحت ہوگی۔''

''اماں! آخر اس کام میں اللہ کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے جب کہ ان کا نقصان ہو گیا۔'' آج جب میں نے یہ الفاظ سنے تو جھنجھلا گیا۔

''بیٹا! ہو سکتا ہے کہ اللہ اس واقعے کے ذریعے ان کو سوچنے کا موقع دیں اور اگر اس میں کوئی حرام پیسہ لگا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ اس نقصان سے کسی بڑی مصیبت سے بچ جائیں۔'' اماں میری کم عقلی پر ماتم کرتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

اس وقت تو اماں جان کی باتیں میرے اوپر سے گزر گئیں لیکن آج کے واقعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ہوا یوں کہ آج مجھے سفر کے لیے دوسرے شہر جانا تھا۔ میرا بیٹا مجھے اڈے پر چھوڑنے جا رہا تھا کہ عین موقع پر موٹر سائیکل پنکچر ہو گیا۔ اڈا ہمارے گھر سے کافی دور تھا، اس لیے میں پیدل بھی نہ جا سکتا تھا۔ موٹر سائیکل صحیح کرواتے کافی وقت ہو گیا اور میری مطلوبہ بس نکل گئی۔ مجھے بہت افسوس ہوا اور میں قسمت کو کوستا واپس لوٹ کر آ رہا تھا۔ گھر واپس آتے وقت میرے کانوں میں اماں کے الفاظ گونج رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ آج بھی اماں جان یہی کہیں گی لیکن اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے کہ میرا ضروری کام رہ گیا۔

جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ میرا چھوٹا بیٹا ایان استری والی تار سے چپٹا ہوا ہے۔ میں نے بھاگم بھاگ سوئچ آف کیا اور فوراً اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر نے ڈریس وغیرہ لگانے کے بعد بتایا کہ اگر پانچ منٹ کی دیر ہو جاتی تو آپ کا بیٹا نہ بچ پاتا۔ آپ کی قسمت اچھی کہ آپ بروقت پہنچ گئے۔ ہوا یوں کہ میری بیوی اور اماں جان کام کاج میں مصروف تھیں۔ ایان کھیلتے ہوئے اس تار تک پہنچ گیا اور نہ جانے کب اس نے تار کو پکڑ لیا۔ اگر میری بس نہ نکلتی اور میں واپس نہ لوٹتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ شام کو مجھے اطلاع ملی کہ وہ بس کسی فنی خرابی کی وجہ سے حادثے کا شکار ہو گئی اور اس میں موجود تمام مسافر جاں بحق ہو گئے۔ یہ خبر سن کر مجھے اچھی طرح سمجھ آیا کہ واقعی ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔

(تیسرا انعام:125 روپے کی کتب)

دعا کا اثر

(اسوہ چاولہ)

آمنہ ایک سولہ سال کی لڑکی تھی، جو اپنی بیوہ ماں تسنیم کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی خالہ رشیدہ حافظ قرآن ہیں اور درس دیتی ہیں اور آمنہ اور اس کی والدہ کا خیال رکھتی تھیں۔

اندھیری رات تھی۔ تاریکی ہر سو چھائی ہوئی تھی۔ پتا بھی ہلتا تو دل دھڑکنے لگتا۔ آمنہ گھر پر تنہا تھی، اتنے میں دروازے پر اک زوردار دستک ہوئی۔ یہ پہلی دستک تھی، جو دل دہلا دینے والی تھی۔ آمنہ نے ڈرتے ڈرتے قدم بڑھائے اور دروازے کی طرف چل پڑی۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچی نہ تھی کہ اک اور دستک ہوئی۔ اب وہ اتنا ڈر گئی کہ اک قدم بھی چلنا مشکل ہو گیا اور وہی رُک گئی۔ اس نے وہیں سے پوچھنا مناسب سمجھا مگر.....! اس کی زبان نے اس کے الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔ اس کے بعد ایک اور دستک ہوئی جو آخری دستک معلوم ہوتی تھی۔

دستک دینے والا واپس جا چکا تھا۔ وہ واپس آئی اور امی کو فون ملایا۔ (امی جو شام کو بازار گئی تھی اور اس کے بعد واپس نہ آئی۔) امی کا فون بند جا رہا تھا، اب اس نے خالہ جان کو فون ملایا، گھنٹی جا

رہی تھی۔ کافی دیر بعد خالہ کی آواز آئی۔ ''السلام علیکم!'' خالہ نے حسب معمول مگر حیرانگی سے کہا۔

''وعلیکم السلام! خالہ جان! خالہ جان! وہ امی......'' آمنہ پریشانی میں یک دم بول پڑی۔

''آمنہ! کیا ہوا تسنیم کو؟ سب خیریت تو ہے؟ اللہ خیر کرے، بتاؤ مجھے!'' خالہ نے پریشانی کے عالم میں بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ...... خالہ! امی شام کو سات بجے گھر سے گئی تھیں، گھر کے لیے کچھ سامان لانا تھا وہ ابھی تک نہیں آئیں۔ فون بھی بند جا رہا ہے۔'' آمنہ نے افسردگی سے کہا اور رونا شروع کر دیا۔

''خالہ مجھے نہیں پتا کہیں سے بھی میری امی لا کر دیں۔'' آمنہ نے روتے روتے ضد میں آ کر کہا۔ ''بیٹا حوصلہ رکھو اور مجھے یہ بتاؤ، کیا آج تم نے عشاء کی نماز پڑھی ہے؟'' خالہ نے حوصلہ دیتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں خالہ! بھول گئی۔'' آمنہ نے شرمندگی سے بتایا۔

''اچھا چلو، جاؤ نماز پڑھو اور اللہ سے دعا کرو اور رو رو کر فریاد کرو کہ یا اللہ! مجھے میری ماں مجھے دے دے۔ تیری مدد کے بغیر بندہ کچھ نہیں کر سکتا اور ان شاء اللہ دیکھنا امی ضرور گھر آ جائیں گی۔'' خالہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا خالہ، خدا حافظ! شکریہ۔'' آمنہ نے خالہ کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''خدا حافظ بیٹا! امی آ جائیں تو اطلاع کر دینا۔'' خالہ نے کہا۔

''جی بہتر خالہ!'' آمنہ نے کہا۔

پھر آمنہ نے نماز پڑھی۔ ابھی دعا ہی کر رہی تھی کہ دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ آمنہ نے دیکھا تو وہ امی تھیں۔ آمنہ جھٹ سے لپٹ گئی۔ امی نے بتایا کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور سر پر چوٹ آئی تھی۔ موبائل بھی ٹوٹ گیا تھا۔ انہوں نے کسی کو گھر بھیجا تھا مجھے اطلاع کرنے کے لیے مگر میں نے دروازہ نہ کھولا۔ آمنہ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور خالہ کو اطلاع دی۔ اس دن اس نے ایک بات سیکھی کہ سچے دل سے کی گئی دعا اللہ کے دربار میں کبھی رد نہیں ہوتی۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

مقصد کی تلاش

(ارم اشرف، بھکر)

وہ اس کشمکش کی وجہ سے دن بہ دن لاغر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ اس کے تصورات کا شیش محل تو اسی دن زمین بوس ہو گیا تھا جب اس کے باپ نے یہ فیصلہ سنایا کہ ''بس اب گلاوش اسکول نہیں جائے گی۔ اس کی پڑھائی کا کوئی فائدہ نہیں۔ لڑکیاں گھر سنبھالتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ آج سے یہ گھر کے کاموں میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹائے گی۔'' ابا کی کہی ہوئی باتیں جب اس کی ننھی سماعت سے ٹکراتیں تو اس کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے اور اب نہ تو وہ کچھ کھاتی اور نہ ہی کچھ پیتی۔ جب اس کی ماں سے اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھی نہ گئی تو اس نے گلاوش کے باپ سے امتحان تک گلاوش کو پڑھنے کی اجازت دینے کو کہا۔ پہلے تو اس کے باپ کا جواب نفی میں تھا مگر بیوی کی ضد کی وجہ سے انہوں نے گلاوش کو امتحان دینے کی اجازت دے دی۔

اب اس کا پڑھائی میں دل نہ لگتا۔ بس ایک ہی سوال اس کے ذہن میں اٹھتا کہ ''آخر اس کے ابا اسے پڑھنے کیوں نہیں دیتے؟'' نہ ہی ان کے ہاں پیسے کی قلت ہے اور نہ ہی گھر میں کوئی اور پریشانی ہے۔ اس بارہ سالہ بچی کے ذہن میں جب یہ سوال پیدا ہوتے تو وہ اپنی توجہ ہٹانے کی خاطر اپنے یہ خیالات جھٹک دیتی مگر یہ خیالات ہمیشہ اس کا تعاقب کرتے۔ ایک دن وہ کلاس روم میں بیٹھی اپنے سوالات کی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسلامیات کی کتاب پر لکھی ہوئی حدیث نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔''

اس دن اس نے گھر جا کر ابا سے کہا۔ ''ابا! علم حاصل کرنا تو ہر مسلمان مرد، عورت پر فرض ہے تو پھر مجھے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت......؟'' ابھی اس کا سوال پورا بھی نہ ہو پایا تھا کہ اسے اس کے سوال کا جواب ایک زوردار تھپڑ کی صورت میں ملا جو اس کے نازک گالوں پر سرخی چھوڑ گیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دو مہینے بعد وہ امتحان سے بھی فارغ ہو گئی اور پڑھائی سے بھی۔ یہ غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ اس کی ڈاکٹر بننے کی خواہش اب حسرت بن چکی تھی۔ وہ اپنے مستقبل کو تو تاریک ہونے سے نہ بچا سکی مگر وہ دوسری لڑکیوں کو علم کی روشنی سے آراستہ کرنا چاہتی تھی۔ جیسے تیسے ان سوالوں کے ساتھ اس کی خاردار زندگی گزر رہی تھی۔ ایک دن جب وہ پڑوسیوں کے گھر گئی تو

اس نے ان کی چار سالہ بچی دعا کو گھر میں کھیلتے دیکھا۔ اس نے کہا۔
''چچی! آپ نے ابھی تک اسے اسکول داخل نہیں کروایا؟ چار سال کی عمر میں تو بچے اسکول جانے لگتے ہیں۔ کیا کوئی مالی مسئلہ ہے؟''

''نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں مگر چوں کہ اسکول یہاں سے کچھ دور ہے، لہٰذا اسے لانے اور چھوڑ کر آنے کا مسئلہ ہے اور اس کے ابا کو تو اس کی تعلیم کا بڑا شوق ہے مگر ان کو اتنی فرصت کہاں کہ اسے روز اسکول چھوڑ آئیں۔'' گلاوش اس دن گھر آئی تو گم صم سی تھی۔ اس نے دعا کے مستقبل کو بچانے کا فیصلہ کیا۔ صبح ہوتے ہی وہ دعا کے گھر گئی اور اس کی امی کو کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں اسے پڑھا دیا کروں۔ یہ سن کر دعا کے ابا بہت خوش ہوئے اور فوراً رضامند ہو گئے۔ یوں گلاوش، دعا کی استانی بن گئی۔ اب بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور وہ دل لگا کر انہیں پڑھاتی رہی۔ بچے اس کے پاس ابتدائی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر جاتے رہے۔ وقت کا پنچھی پَر لگا کر اُڑتا رہا۔ اب گلاوش بوڑھی ہو چکی تھی۔ وہ خود تو ڈاکٹر نہ بن سکی مگر بہت سے ڈاکٹر اس کے شاگرد تھے۔ اس نے یہ جان لیا تھا کہ:

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

☆☆☆

عقل مندی

مسلمان اطباء میں محمد بن زکریا الرازی کا علمی مقام بہت اونچا ہے۔ رازی کی طبی زندگی میں بہت عجیب و غریب واقعات ملتے ہیں۔ ایک دفعہ بغداد کا ایک امیر نوجوان ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے خون کی قے کی شکایت تھی۔ رازی نے اس کا معائنہ کیا، مختلف سوالات پوچھے لیکن بیماری کا سبب نہ جان سکے۔

جب رازی نے مریض کو بتایا کہ وہ مرض کا سبب معلوم نہیں کر سکے تو مریض بے بسی کے عالم میں رونے لگا۔ امید کی آخری کرن نے بھی دم توڑ دیا۔

رازی کو بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے مریض کا دوبارہ معائنہ کیا اور مرض کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کئی سوالات کیے۔ مریض نے بتایا کہ دوران سفر اسے پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے شدید مجبوری کی حالت میں تالابوں اور جوہڑوں کا پانی استعمال کیا۔ یہ سنتے ہی رازی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ نوجوان مریض اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ حکیم رازی نے اس سے کہا۔ ''میں کل تمہارے گھر آؤں گا اور تمہارا علاج کروں گا۔''

دوسرے دن حکیم رازی اپنے دو شاگردوں کے ساتھ نوجوان کے گھر گئے۔ ان کے ساتھ ''کائی'' سے بھرے ہوئے دو گھڑے تھے۔

انہوں نے نوجوان کو کائی کھانے کا حکم دیا اور کہا۔ ''جب تک میں نہ کہوں، کھاتے چلے جاؤ۔''

مگر مریض نے انکار کر دیا۔ حکیم رازی نے خادموں کو حکم دیا۔

''اسے لٹا دو اور اس کا منہ کھولو۔'' خادموں نے حکم کی تعمیل کی اور خود رازی کے منہ میں کائی ٹھونستے رہے۔ یہاں تک کہ نوجوان کو زور کی قے آئی اور پھر سارا کھایا ہوا باہر نکل آیا۔

رازی نے قے کا معائنہ کیا تو اس میں ایک جونک تھی۔ رازی، نوجوان سے مخاطب ہوئے۔

''تمہارا مرض دور ہو گیا ہے تم تالابوں کا پانی استعمال کرتے وقت ایک جونک بھی نگل گئے تھے۔ جو تمہارے معدے سے چمٹ گئی تھی اور جب اسے کائی نظر آئی تو وہ معدہ چھوڑ کر اپنی مرغوب غذا کائی سے آ لپٹی اور قے کے ساتھ باہر نکل آئی۔''

اس طرح رازی کی عقل مندی کی وجہ سے وہ نوجوان صحت یاب ہو گیا۔

(محمد معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان)

محترمہ تعلیم و تربیت: السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟
میں نے آپ کو بہت سے خط لکھے لیکن آپ نے کوئی خط شایع نہیں کیا۔ میری امی جان کہتی ہیں کہ جتنی بار ہار ملے اتنی ہی دفعہ جیتنے کی کوشش کرو۔ اس لیے میں بھی خط بھیجتی رہوں گی۔ ویسے ناراضگی آپ سے ہے، تعلیم و تربیت سے نہیں، اس لیے میں اس کی تعریف کرنا چاہوں گی۔ جنوری 2016ء کا تعلیم و تربیت فرسٹ کلاس تھا اور سرورق تو انتہائی خوب صورت تھا۔ اُمید ہے اگلا میگزین اس سے بھی اچھا ہوگا۔ شکریہ! اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

(تحریم مختار، لاہور)

☆ ڈیئر تحریم مختار! خط لکھنے کا شکریہ! اُمید ہے اب آپ کی ناراضگی ختم ہو جائے گی۔

پیاری پیاری آپی! آپ کو آئندہ کبھی خط نہیں لکھوں گی کیوں کہ آپ نام شائع کرتے ہیں، نہ خط۔ پلیز! کم از کم نام شائع کر دیا کریں۔ میرا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ میں پڑھائی میں مصروف ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ لکھ نہیں پاتی۔ جنوری کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ اب آپ کون سا ناول شائع کریں گے؟ جواب ضرور تحریر فرمایئے گا۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔ میرے پاپا بچپن سے اسے پڑھ رہے ہیں۔ آخر میں میری طرف سے سب کو "نیا سال" بہت بہت مبارک ہو۔ (مومنہ عامر حجازی، لاہور)

☆ اے حمید کا ناول "چاندنی رات میں سانپ" فروری کے شمارے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

پیاری ایڈیٹر باجی جان! اُمید ہے پورا ادارہ خیریت سے ہو گا۔ دو خوش خبریاں ایک تو ہماری سال گرہ ہے اور دوسرا ہمارا ایک سال۔ جی ہاں! ایک سال پورا جو ہو گیا اپنے آپ کو پڑھتے ہوئے۔ ارے باجی! ہمارا مطلب تھا اس رسالے کو پڑھتے ہوئے۔ کیا آپ ہمیں مبارک باد نہیں دیں گی۔ اوہ یہ کیا! میں تو اپنے بارے میں ہی کہے جا رہی ہوں۔ چلیے، اب آپ کو پیاری سی ثمن رؤف کی طرف سے دعائیں۔ شاد رہیں اور آباد رہیں۔ یہ میرا پیارا رسالہ ہر دم کھلتا اور مسکراتا رہے۔ یہ میرا پیارا رسالہ ہے۔ (ثمن رؤف، لاہور)

☆ ثمن رؤف اپنی تحریریں بھیجیں اور آپ کو سال گرہ مبارک ہو۔

میں عیشہ فاطمہ فیصل آباد سے! مجھے اس بات پر بہت خوش ہوئی کہ پہلے تو تعلیم و تربیت قریبی دُکان سے لیا کرتی تھی مگر اب وہ میرے گھر میں آتا ہے۔ چمکتا دمکتا تعلیم و تربیت اس ماہ بہت ہی اچھا تھا۔ اس کی تعریف کے لیے میں بس اتنا کہتی ہوں:

زندگیاں ختم ہوئیں اور قلم ٹوٹ گئے
تیرے اوصاف کا اک باب بھی پورا نہ ہوا

میں نے اس دفعہ "آپ بھی لکھیے" میں حصہ لینے کے لیے کہانی لکھی ہے۔ اگر آپ کو پسند آئے تو ضرور شامل کریں۔ ہونہار مصور کے لیے تصویر بھی بنائی ہے۔ اگر اچھی ہوئی تو ضرور شامل کریں۔

☆ عیشہ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ! کہانی معیاری ہوئی تو ضرور شائع کریں گے۔

اُمید ہے کہ خیریت سے ہوں گی۔ اس ماہ کا تعلیم و تربیت لاجواب تھا۔ سرورق سے لے کر کہانیوں تک ہر چیز بے مثال تھی۔ زندہ لاش ناول شان دار تھا۔ اُمید ہے کہ اب آپ کوئی اور لاجواب ناول لائیں گے۔ میں گزشتہ چند ماہ سے کچھ وجوہات کی بناء پر تعلیم و تربیت کے سلسلوں میں مستقل حصہ نہ لے سکی مگر خط مسلسل بھیجتی تھی جو شاید آپ کی ردی کی ٹوکری کو زیادہ ہی پسند آتے تھے اور وہ انہیں اپنے لیے منتخب کر لیتی تھی۔ گزارش ہے ردی کی ٹوکری سے کہ وہ اپنی پسند بدل لے کیوں کہ اب مجھے رسالے میں جگہ ملنی چاہیے۔ اس ماہ سبق اور سیب کا درخت اچھی کہانیاں تھیں۔ خوش رہیں، خوش رکھیں۔ آپ سے ملاقات ہو گی اگلے ماہ۔ ان شاء اللہ!

(ایمان زہرہ، لاہور)

ڈیئر ایڈیٹر صاحبہ! آپ کیسی ہیں؟ اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب قارئین اور تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو دلی مبارک ہو کیوں کہ آپ کی محنت سے تعلیم و تربیت بہت ترقی کرتا جا رہا ہے۔ میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور مجھے اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ یہ میرا محبوب اور پسندیدہ رسالہ ہے۔

جنوری کا شمارہ زبردست تھا۔ مجھے ساری کہانیاں بہت پسند آئیں۔ میں نے کہانی لکھی ہے ضرور شائع کیجیے گا۔ ناول ''زندہ لاش'' بہت اچھا تھا۔ میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ ردی کی ٹوکری سے دور رکھیے گا۔ اُمید ہے میرا یہ خط اگلے شمارے میں شائع کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائیں گی۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین!) بہت محبت کے ساتھ میری طرف سے تعلیم و تربیت کے لیے:

پھول تو بہت سے ہیں لیکن گلاب جیسا کوئی نہیں
رسالے تو بہت سے ہیں لیکن تعلیم و تربیت جیسا کوئی نہیں۔

(سارا ارشد، سرگودھا)

☆ خط لکھنے کا شکریہ۔

محترم ایڈیٹر صاحب! میں کچھ نظمیں سورج، دعا اور حمد و ثنا بھیجنا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز اسے رنگین والے صفحے پر چھاپیے گا، مہربانی ہوگی۔ آپ مجھے گائیڈ کریں کہ میں کن موضوعات پر لکھوں تاکہ میری اصلاح ہو اور میں بچوں کے لیے بامقصد کہانیاں لکھ سکوں، بہت شکریہ!

(ثمرہ احمد سعید بٹ، سیالکوٹ)

☆ ڈیئر ثمرہ! آپ مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کریں اور خط میں اپنا رابطہ نمبر ضرور لکھیں۔

کیا حال ہے؟ اُمید ہے آپ ٹھیک ہوں گی۔ میں نے پچھلے مہینے خط لکھا تھا جو شائع بھی ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور مجھے اُمید ہے کہ آپ میرا یہ خط بھی ضرور شائع کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائیں گی۔ اس ماہ کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ سرورق تو بہت ہی خوب صورت تھا۔ کہانیاں سیب کا درخت، شرط، گلی کے کونے والا مکان، چاند کی فرمائش اور نواب صاحب کے زرافے بہترین کہانیاں تھیں۔ آپ نے کھٹر کھاند گروپ اور چچا تیز گام کا سلسلہ کیوں بند کر دیا ہے۔ اس کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ ناول زندہ لاش کی آخری قسط پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ آپیے مسکرایئے سے دوستوں کو سنانے کے لیے بہت سے مزے دار لطیفے مل جاتے ہیں۔ ذائقہ کارنر سے میں نے بہت سی کھانے کی اشیاء بنانا سیکھی ہیں۔ مجھے یہ رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے۔ اُمید ہے آپ میری اس تحریر کو ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گی۔ اللہ کرے، یہ رسالہ ہمیشہ جگمگاتا رہے اور اسے بہت زیادہ شہرت ملے۔ آمین!

(مریم جاوید، مظفر آباد)

☆ ان شاء اللہ! تعلیم و تربیت آپ کو جلد دستیاب ہوا کرے گا۔

اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ تعلیم و تربیت ہمارے گھر میں 2004ء سے مسلسل اب تک آ رہا ہے۔ پہلے بھی کئی بار خط لکھا لیکن پذیرائی نہیں ملی، پھر کبھی لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اب اس اُمید سے خط لکھ رہا ہوں کہ میرا خط بھی شائع ہوگا۔ پلیز! میرا خط ضرور شامل کریں۔

(وقاص احمد قادری، لالہ موسیٰ)

ڈیئر ایڈیٹر صاحبہ کیسی ہیں آپ؟ ہمیں ہر مہینے تعلیم و تربیت کا انتظار رہتا ہے لیکن اس دفعہ آپ لوگوں نے کچھ زیادہ ہی انتظار کروایا۔ اس مہینے تعلیم و تربیت 5 جنوری کو ملا۔ اس بات سے ناراضگی ہے۔ پھر ہم 10 تاریخ کو جوابات کیسے بھیجا کریں؟ اس دفعہ سیب کا درخت سپرہٹ تھی۔ کیا آپ جانتے ہیں؟ حضرت خالد بن ولید، گلی کے کونے والا مکان، نواب صاحب کے زرافے، سبق کہانیاں بہت زیادہ پسند آئیں۔ پچھلی دفعہ میرا خط شائع ہوا تھا تو میں نے اسے اپنی دوستوں اور اپنی ٹیچرز کو دکھایا تھا تو سب نے کہا واہ جی واہ۔ پچھلے مہینے کھوج لگایئے میں میرا انعام بھی نکلا تھا۔ وہ کتاب مجھے مل گئی ہے۔ بہت بہت شکریہ! معاف کیجیے گا میں نے کچھ زیادہ ہی طویل خط لکھ دیا۔ آخر میں کہنا چاہوں گی، اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ آمین ثم آمین، خدا حافظ!

(بانیہ رضا، لاہور)

میں تعلیم و تربیت تقریباً دو سال سے پڑھ رہا ہوں۔ آپ کا یہ کارنامہ بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے بہت مفید ہے۔ مجھے کہانی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری کہانی میرے پسندیدہ رسالے میں شائع ہو۔ زندگی میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ اس لیے ضرور شائع کیجیے گا۔

(توفیق احمد)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

اقصیٰ شمشیر۔ حبیب الرحمٰن ملک۔ سید محمد شوذب نقوی، لاہور۔ بلوشہ رحمان، اکوڑہ خٹک۔ حافظ آمنہ ہاشم، واہ کینٹ۔ رافع اعجاز، لاہور۔ شیب مقصود، فیصل آباد۔ حرا سعید، فاطمہ نیاز، چوک گروٹ۔ حرا سعید شاہ، جوہر آباد۔ حبیب الرحمٰن ملک۔ سیدہ زہرا بانو رضوی، راولپنڈی۔ ایمن اعجاز، بازہ ہملت صوابی۔ عمران خان غوری، بہاول پور۔ ریاض حسین ثمرہ منگلا ڈیم۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ عثمان علی بھٹی، لاہور۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ محمد احمد، ڈیرہ غازی خان۔ عارف شین روحیلہ۔ کائنات آفتاب، لاہور۔ عدن بشیر، ساہی وال۔ حسن رضا عابدی، کاموکے۔ ثمر فاروق، گوجرانوالہ۔ قمر سلیم، وزیرآباد۔ سمیہ توقیر، اٹک۔ محمد ارسلان خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ طلحہ بسیم، اوکاڑہ۔ منابل نواز، کلور کوٹ۔

بطخ کا وجود انسان سے بھی پہلے کا ہے۔ یہ کوئی پندرہ کروڑ سال پہلے سے زمین میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان کی لاکھوں قسمیں آئی ہیں لیکن آج کل بطخوں کی ایک سو پندرہ سے کچھ زائد قسمیں موجود ہیں۔ ان کو تین بڑی قسموں میں ترتیب دیا گیا ہے۔

ایک قسم وہ ہے جو صرف پانی کی سطح پر ہی رہتی ہے اور غذا حاصل کرنے کے لیے صرف اپنا سر پانی میں ڈبوتی ہے۔ یہ عام بطخ ہوتی ہے جو ہر جگہ پائی جاتی ہے مثلاً ملارڈ بطخ۔ دوسری قسم کی بطخیں وہ ہیں جو کہ غوطہ خور بطخیں ہوتی ہیں۔ یہ خوراک حاصل کرنے کے لیے پانی کے اندر باقاعدہ غوطہ لگاتی ہیں۔ یہ بہت عمدگی سے تیرتی ہیں اور بعض اوقات سمندر میں بھی رہتی ہیں۔ ان کی چونچ پتلی ہوتی ہے تاکہ مچھلی کا شکار کر سکیں کیوں کہ ان کی غذا مچھلی ہوتی ہے۔ اس قسم کی بطخوں میں مدگانزر اور آئیڈر نامی بطخیں آتی ہیں۔

تیسری قسم وہ ہے جو خشکی پر رہتی ہے اور کبھی کبھار پانی میں چلی جاتی ہے، لہٰذا خشکی پر رہنے کے لیے اور چلنے پھرنے کے لیے دیگر بطخوں کے مقابلے میں ان کے پیر ذرا بڑے ہوتے ہیں اور لمبے بھی۔ اس قسم کی بعض بطخیں درختوں پر گھونسلا بناتی ہیں۔ مثلاً ووڈ اور مسکوی بطخ۔

اکثر بطخوں کا گھر پانی کے قریب ہوتا ہے کیوں کہ بطخ پانی میں ہی رہنا پسند کرتی ہے۔ سوائے اس تیسری قسم کے جو خشکی پر زیادہ وقت گزارتی ہے۔ بطخیں دریاؤں، جھیلوں، نہروں، تالابوں یا جوہڑ کے آس پاس رہتی ہیں جب کہ بعض اقسام تو سمندر میں رہتی ہیں۔

قدرت نے اس کو سمندری پانی پینے اور اس میں سے زائد نمک علیحدہ کرنے کا خاص انتظام دیا ہوا ہے۔ بطخ ایک پرندہ ہے جس طرح کبوتر، چیل، کوا اور دیگر چڑیاں پرندہ ہیں۔ اسی طرح بطخ بھی پرندوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

بطخ دراصل پانی میں رہنے والا جانور ہے۔ یعنی وہ جانور ہے جو اُڑنے کے ساتھ ساتھ پانی میں بھی تیر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے عام پرندوں کے مقابلے میں ذرا مختلف شکل و صورت کا ہے۔ ظاہری طور پر بطخ کا جسم چھوٹا گول سا ہوتا ہے۔ اس کی گردن چھوٹی اور ٹانگیں جسم کے پچھلے حصے کی طرف ہوتی ہیں۔ پیر بھی چھوٹے ہوتے ہیں اور پنجے میں تین انگلیاں ہوتی ہیں جن کے درمیان کھال کی جھلی ہوتی ہے۔ پاؤں کی انگلی کا رُخ پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ اس قسم کے پاؤں دوسرے پرندوں میں نہیں پائے جاتے اور

یہی وجہ ہے کہ ان پاؤں کی مدد سے بطخ پانی میں باسانی تیر سکتی ہے۔ بطخوں کی چونچ چپٹی اور چوڑی ہوتی ہے۔ پَر بھی چھوٹے اور نوکیلے ہوتے ہیں۔ بطخ کے پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے پَر موجود ہوتے ہیں جن سے اس کا جسم ڈھکا رہتا ہے اور آس پاس کے موسم سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ یہ پَر رنگین بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ خوب صورت نظر آتی ہیں۔ بطخوں کی مختلف اقسام کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی ہوتی ہیں۔ بعض انتہائی شوخ رنگوں کی مثلاً چمک دار، گہرا سرخ، گہرا نارنجی اور بھورا۔ سب سے زیادہ اور خوب صورت بطخ ''مندارن'' ہوتی ہے جو پاکستان میں بہت کم پائی جاتی ہے۔

سال میں ایک دفعہ مادہ بطخ انڈے دیتی ہے۔ یہ ایک موسم میں دس سے بیس عدد تک انڈے دیتی ہیں۔ اس وقت بطخ جھک کر اپنے جسم کے تمام پر گرا دیتی ہے۔ اس طرح اس کے جسم سے گرمی بغیر کسی رکاوٹ کے انڈے تک پہنچ جاتی ہے اور اسی عرصے میں وہ اڑنے سے بھی قاصر ہوتی ہے۔ نئے پَر اُگنے میں چار سے پانچ ہفتے لگ جاتے ہیں۔ بطخ کے انڈے بے داغ، سفید اور مٹیالے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کا سائز مرغی کے انڈے کے قریب قریب ہوتا ہے مگر بطخ کا انڈا مرغی کے انڈے سے ذرا سا لمبا ہوتا ہے۔ جب انڈے سے بچہ نکلتا ہے تو بطخ ان کے پیدا ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ان کو پانی میں لے جاتی ہے اور یوں وہ چوزے فوراً تیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چوں کہ ان کے پَر نہیں ہوتے لہٰذا وہ اڑ نہیں سکتے۔ جب چار پانچ ہفتوں بعد ان کے پَر نکلتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ اڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس عرصے میں بطخ اپنے بچے کو کھانا کھلا کر موٹا تازہ کرتی ہے۔

اڑنے کے لیے بطخ اپنے بڑے پَر استعمال کرتی ہے۔ چھوٹی بطخ کا چوں کہ وزن کم ہوتا ہے لہٰذا وہ کھڑے کھڑے ہی اُڑتی ہے جس طرح ہیلی کاپٹر اُڑ جاتا ہے جب کہ بڑی بطخوں کو اڑنے کے لیے پہلے ''رن وے'' کی طرح دوڑنا پڑتا ہے اور پھر وہ ہوا میں ''ٹیک آف'' کرتی ہیں۔ اُڑتے ہوئے بعض دفعہ کرتب بھی دکھا دیتی ہیں اور قلابازیاں کھاتی ہیں اور تیزی سے گول گھومتے ہوئے نیچے کی طرف گرتی ہیں۔ بطخیں چالیس سے پچاس کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے اُڑتی ہیں اور جب کسی جہاز وغیرہ سے ڈر جائیں تو پھر

60 کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے بھی اڑ لیتی ہیں۔ بطخیں سرد موسم میں قطب شمالی کے سرد علاقوں میں مثلاً سائبیریا وغیرہ سے گرم علاقوں یعنی جنوب کی طرف نقل مکانی کرتی ہیں۔

بطخ کی آنکھیں اور کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ یہ دور دور کی چیزیں اور آوازیں بہت آسانی سے دیکھ اور سن لیتی ہیں۔ مگر بطخ کی سونگھنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ بطخ کی مخصوص آواز ہوتی ہے جس سے یہ دوسری بطخوں سے بات چیت کرتی ہے۔ بطخ کے گلے میں ایک اُبھار ہوتا ہے اور یہ آواز اس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بطخ ہر قسم کے موقع کے لیے الگ آواز نکالتی ہے مثلاً خطرہ ہو تو ایک چیخ نما آواز اور ایسے مختلف آوازیں۔

بطخ کی اوسط عمر پندرہ سے بیس سال ہوتی ہے۔ دنیا کی سب سے چھوٹی بطخ اناس نام کی ہے جو صرف دس انچ کی ہوتی ہے جب کہ سب سے بڑی بطخ کی جسامت چوبیس انچ سے بھی زیادہ ہے۔

جنگلی بطخ کا شکار پوری دنیا میں مشہور ہے اور خود ہمارے پاکستان میں کھیلا جاتا ہے۔ سندھ اور پنجاب میں بطخوں کا کافی شکار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بطخ گھروں میں بھی پالی جاتی ہے۔ بطخ کو پاکستان سمیت پوری دنیا میں کھایا جاتا ہے۔ بطخ انسانوں کی طرح تھک بھی جاتی ہے اور سوتی بھی ہے لیکن ان کی نیند چھوٹے چھوٹے وقفوں میں ہوتی ہے جس کے دوران یہ آنکھیں کھولتی اور بند کرتی رہتی ہیں۔ سوتے ہوئے بطخ سر کو کندھے کی جانب موڑ لیتی ہے اور چونچ کو ایک طرف کے پَر کے نیچے چھپا لیتی ہے۔

☆☆☆

ٹیبل ٹینس

آر ایم شاہد

ٹیبل ٹینس کا آغاز 1880ء کی دہائی میں برطانیہ سے ہوا۔ ابتداء میں یہ امراء کا کھیل تھا۔ ٹیبل ٹینس کو پنگ پانگ (Ping Pong) بھی کہا جاتا ہے۔ اس نام کے حوالے سے ایک دل چسپ بات مشہور ہے۔ چوں کہ اس زمانے میں کھلاڑیوں کے پاس کھیلنے کے لیے بلّے نہیں ہوتے تھے تو وہ اس کھیل کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے ہی کھیلا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ایسے بلّے ایجاد ہوئے جن کے دونوں اطراف چمڑے کی کھال لگی ہوتی تھی جب کہ گیند سیلولائیڈ کا ہوتا تھا۔ جب بلّے سے گیند کو میز پر پھینکا جاتا تو اس میں سے ''پنگ پانگ'' جیسی آواز نکلتی۔ یوں اس کا نام ''پنگ پانگ'' پڑ گیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کھیل میں لکڑی کے بلّے استعمال ہونے لگے۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد لکڑی کے بلّے پر دانے دار ربڑ لگا دیا گیا جس سے یہ کھیل بآسانی کھیلا جانے لگا۔ پھر اس کا نام ٹیبل ٹینس رکھ دیا گیا۔ یہ تھی ''پنگ پانگ'' سے ''ٹیبل ٹینس'' تک کی کہانی۔

اس کھیل کے قوانین انٹرنیشنل ٹیبل ٹینس فیڈریشن (ITTF) طے کرتی ہے۔ اس فیڈریشن کے 217 ممالک ممبرز ہیں۔ 1988ء میں اس کھیل کو اولمپکس کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس کھیل میں گیند سفید یا اورنج رنگ کی ہوتی ہے۔ گیند پر اگر تین ستارے لگے ہوں تو اسے سب سے بہترین گیند سمجھا جاتا ہے۔ ٹیبل ٹینس کے لیے استعمال کی جانے والی گیند کھوکھلی اور مسالے سیلولائیڈ (Celluloid) کی بنی ہوتی ہے۔ گیند کا قطر 1.4 سے 1.5 تک ہوتا ہے جب کہ وزن 2.4 گرام سے 2.53 گرام تک ہوتا ہے۔ اس کھیل میں استعمال ہونے والی میز 9 میٹر لمبی اور 1.52 میٹر چوڑی ہوتی ہے۔ میز زمین سے تقریباً 76 سینٹی میٹر بلند ہوتی ہے۔ میز کے درمیان 15.25 سینٹی میٹر کا بلند جال (Net) لگا ہوتا ہے۔ میز کی لمبائی کے رُخ ایک سفید لائن لگائی جاتی ہے جو میز کی سطح کو چار حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ میز کے معیار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ٹیبل ٹینس کا گیند اگر 12 انچ کی بلندی سے گرائیں تو وہ میز کے کسی بھی مقام پر 9 انچ سے زیادہ نہ اچھلے۔ گیند کے اُچھلنے کی بلندی میں میز کے ہر مقام پر یکسانیت ضروری ہے۔ ''کھیلنے کی سطح'' کے لیے چوڑائی کے رُخ حدود کی لکیروں کو اینڈ لائن (End Line) جب کہ لمبائی کے رُخ حدود کی لکیروں کو سائیڈ لائن (Side Line) کہا جاتا ہے۔ میز کے دونوں اطراف کو کھیلنے کی سطح میں شامل نہیں کیا جاتا۔ نیٹ کی لمبائی عموماً 6 فٹ

ہوتی ہے۔ نیٹ کھیلنے کی سطح سے 6 انچ بلند ہو گا۔

اس کھیل میں ریکٹ (Racket) کی لمبائی 16.5 سینٹی میٹر جب کہ چوڑائی 15 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ ریکٹ لکڑی کا بنا ہوتا ہے۔ ریکٹ کو کھیل کی زبان میں پیڈلز (Paddles) بھی کہا جاتا ہے۔ لکڑی کے بنے چھوٹے سے ریکٹ سے، مسالے سے بنی چھوٹی سی کھوکھلی گیند کو ہٹ کر کے نیٹ سے کراس کرتے ہیں۔ ریکٹ کا وزن اور شکل مخصوص نہیں ہے، تاہم اس کا رنگ سفید اور چمک دار نہ ہو۔ اس کا چوڑا حصہ ہموار یا چھوٹے اُبھار جیسا ہوتا ہے۔

اس کھیل میں دو سے چار کھلاڑی حصہ لے سکتے ہیں۔ جب دو کھلاڑی کھیلتے ہیں تو گیم سنگلز کہلاتی ہے۔ جب اکٹھے چار کھلاڑی کھیلیں تو گیم ڈبلز کہلاتی ہے۔ کھلاڑی عام طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو حملہ کرتا ہے اور دوسرا دفاع کرتا ہے۔ حملے سے مراد یہ ہے کہ ایک کھلاڑی حریف کی طرف تیز اور زوردار طریقے سے گیند پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف کا کھلاڑی بھی حملہ کرنے والا ہو تو دیکھنے والوں کے لیے کھیل دل چسپ ہو جاتا ہے کیوں کہ اس وقت کھیل میں تیزی آ جاتی ہے۔

ٹیبل ٹینس کے میچ میں سروس کا فیصلہ ٹاس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ سروس کا مطلب یہ ہے کہ گیند ہاتھ سے ہوا میں اُچھال کر اپنے بلّے کی مدد سے مخالف کھلاڑی کی سمت میں پھینکنا ہے۔ طریقۂ کار کچھ یوں ہوتا ہے کہ اگر دونوں میں سے کوئی کھلاڑی بھی پھینکی ہوئی گیند حاصل نہ کر سکے تو اس کے مخالف کھلاڑی کو ایک پوائنٹ مل جاتا ہے۔ جب سروس کروانے والا کھلاڑی پانچ مرتبہ سروس کروا چکے تو پھر اس کے مخالف کھلاڑی کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سروس کروائے۔

ٹیبل ٹینس کے کھلاڑیوں کی یونی فارم میں گہرے رنگ کی قمیض اور نیکر ہوتی ہے جب کہ سفید لباس وہ نہیں پہن سکتے۔ اس میں کھلاڑی ہموار جوتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ایڑی (Heel) والے جوتے پہننے کی اجازت نہیں ہوتی۔ آخر میں جو کھلاڑی 21 پوائنٹس حاصل کر لیتا ہے، وہ گیم جیت جاتا ہے لیکن جیتنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے 2 پوائنٹس کی برتری حاصل ہو۔ دوسری صورت میں اگر دونوں کھلاڑیوں کے 20، 20 پوائنٹس ہو جائیں تو وہ ہر پوائنٹ کے بعد سروس کریں گے جب تک کہ ایک کھلاڑی دوسرے سے دو پوائنٹس کی برتری حاصل نہ کرے۔ سروس کرنے اور سائیڈ کے انتخاب کا فیصلہ بذریعہ ٹاس ہوتا ہے۔ جو کھلاڑی ٹاس جیت جاتا ہے، اسے سروس کرنے یا وصول کرنے کا اختیار مل جاتا ہے جب کہ ٹاس ہارنے والے کو سائیڈ منتخب کرنے کا اختیار مل جاتا ہے۔ اگر ٹاس جیتنے والا اپنے لیے سائیڈ کا انتخاب کرے تو دوسرے کھلاڑی کو سروس کرنے یا وصول کرنے کا حق مل جاتا ہے۔ ڈبلز میں ہر جوڑے کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ پہلے سروس کون کرے گا اور کون وصول کرے گا۔

☆☆☆

ہمارے پڑوس میں الیاس صاحب اپنے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں۔ سارے محلہ میں وہ اپنی دانائی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لوگ اس لیے بھی ان سے متاثر رہتے ہیں کہ وہ کوئی گھریلو مسئلہ باہمی مشورہ کے بغیر حل نہیں کرتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بیگم الیاس ایک غلطی کر بیٹھیں۔ انہوں نے اپنے لیے خوب مزے کی کافی بنائی لیکن پھر شومئی قسمت اس میں چینی کے بدلے نمک ملا بیٹھیں۔ اب یہ کافی ذائقے کے اعتبار سے سخت بدمزہ ہو چکی تھی۔ اب وہ سوچنے بیٹھ گئیں کہ کیا کریں کیوں کہ یہ نمک ملی کافی تو وہ پی نہیں سکتی تھیں۔ آخر انہوں نے اپنے خاندان والوں کو بلوایا کیوں کہ ناشتے کی میز پر تنہا بیٹھیں سوچ بچار کرتے انہیں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ تمام خاندان ان کے بلانے پر جلد ہی اکٹھا ہو گیا۔ سب نے انتہائی دیدہ زیب کافی چکھی اور سوچ میں ڈوب گئے کہ اس کا کیا کیا جائے۔ معاذ جو سیدھا اسکول سے آ رہا تھا کہنے لگا۔ ''کیوں نہ کسی کیمیاگر سے اس کا حل تجویز کروایا جائے (کیوں کہ ایک کیمیاگر قریبی سڑک کے نزدیک ہی رہتا تھا اور بہت عقل مند گردانا جاتا تھا۔) بیگم الیاس یہ مشورہ فوراً مان گئیں۔ الیاس صاحب نے مشورے پر داد دی اور بچے معاذ کے ساتھ کیمیاگر کے پاس جانے کو تیار ہو گئے۔ لہٰذا بچوں نے اپنے پی ٹی والے بوٹ پہنے اور چل پڑے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ کیمیاگر کوئی ایسا فارمولا ڈھونڈ رہا تھا جو ہر چیز کو سونے میں تبدیل کر دے۔ اس نے ایک لمبی سی بوتل لی تھی اور اس میں سونے اور چاندی کے کتنے ہی ٹکڑے ڈالے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ضروری دھاتیں ڈال کر انہیں پگھلایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ منزل پانے کے بالکل قریب ہے۔ وہ اب سمجھتا تھا کہ وہ کسی بھی چیز کو تقریباً خالص سونے میں تبدیل کر سکتا ہے لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس تجربے میں اپنا سارا سونا جھونک چکا تھا۔ اس نے بیوی کی سونے کی چوڑیاں استعمال کر لی تھیں۔ اپنی نانی کا جڑاؤ زیور خرچ کر لیا تھا۔ اپنی دادی اماں کے مدتوں سے محفوظ کانٹے بھی پگھلا چکا تھا۔ وہ بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ الیاس صاحب کے بچے اس کے پاس پہنچے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بیوی سے گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے استدعا کرے کہ وہ اسے ان کی شادی کی انگوٹھی پگھلانے کے لیے دے دے کیوں کہ اب

اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ کام یاب ہو جائے گا۔ وہ ایسی ہزاروں انگوٹھیاں اپنی بیوی کو بنوا کے دے سکتا ہے بلکہ گھر کا سارا سامان خالص سونے میں تبدیل کر سکتا ہے لیکن اس کی بیوی اس کی سوچ سے بخوبی واقف تھی اور وہ بھی دل ہی دل میں کسی ایسی درخواست کو یکسر ٹھکرانے کی سوچ رہی تھی۔ اب یہ بات تو آپ لوگ بخوبی جان گئے ہوں گے کہ یہ کیمیاگر سیانا دیانا نہیں تھا بلکہ پاگل اور حریص تھا۔ سوچ سوچ کر کیمیاگر اپنا آگ پر اُبلتا یہ سیال مادہ زمین پر گرانے ہی والا تھا لیکن بچوں کو دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ اس نے بڑی خاموشی اور تسلی سے بیگم الیاس پر گزرنے والی مصیبت کے بارے میں سنا۔ پہلے اس نے سوچا کہ بچوں کو صاف کہہ دے کہ وہ اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن پھر معاذ نے جب اسے بتایا کہ وہ اس کا معاوضہ سونے کے سکوں کی صورت میں ادا کریں گے تو اس نے اپنے مختلف محلولوں کی شیشے کی بوتلیں ایک چرمی بیگ میں سنبھالیں اور بچوں کے ساتھ ان کے گھر کی طرف ہو لیا۔

گھر میں پہنچ کر کیمیاگر نے غور سے کافی کو دیکھا پھر اسے چمچ سے اچھی طرح ہلایا۔ پھر اس میں تھوڑا سا سمندری نمک ڈالا۔ تمام خاندان نے کافی کو باری باری چکھا لیکن اس کے ذائقے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی پھر اس نے کافی میں تھوڑا میگنیشیم بائی کلوریٹ ڈال کر ہلایا جو بیگم الیاس کو بالکل بھی پسند نہ آیا۔ کیمیاگر نے کافی میں ہائپر سلفیٹ ڈال دیا لیکن پھر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تب کیمیاگر جیسے کچھ یاد کر کے بولا۔ ”ارے میں تو بھول ہی گیا تھا، اس میں امونیا ڈالنا چاہیے تھا۔“ لیکن وہ غلطی پر تھا۔ امونیا اب کافی کا حل نہیں تھا۔ پھر اس نے باری باری ادغزیلک ایسڈ، سائناک ایسڈ، نارمک ایسڈ، کاربانک ایسڈ، کلورک، ہائپر کلورک، سلفیورک، بورک، نائٹرک ایسڈ ڈالے۔ پھر بیگم الیاس نے کافی کو چکھا۔ کافی کا ذائقہ بہتر ہو چکا تھا لیکن ذائقہ کافی کا ہرگز نہیں تھا۔ اب کیمیاگر نے مایوس ہو کر کافی میں کیلشیم، ایلومینیم، بیریم اور معمولی سا زہر ڈالا۔ اب کافی کا رنگ ان محلولوں کے شامل ہونے سے بہت خوب صورت ہو گیا تھا لیکن ذائقہ ابھی بھی دور دور تک کافی جیسا نہیں تھا۔ اب کیمیاگر بہت مایوس ہو چکا تھا۔ مایوسی میں اس نے کافی میں مزید زخموں پر لگانے والی دوائیاں، کچھ پٹاخے بنانے والا مرکب اور کچھ تھرمامیٹر میں استعمال ہونے والا پارہ ڈالا اور کافی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی گزاری لیکن اس کارگزاری سے بھی بیگم الیاس متاثر نہیں ہوئیں۔ کیمیاگر اب سب کو بتا رہا تھا کہ اس نے کافی سے نمک نکالنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ سبھی اس کی محنت سے متاثر ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ کام یاب نہیں ہوا تھا لیکن انہوں نے کیمیاگر کو اس کی مزدوری ادا کی۔

کیمیاگر کے جانے کے بعد ایک بار پھر وہ تھے اور کافی کا کپ تھا جو ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس بار مشورہ دینے کی باری تزئین کی تھی۔ وہ کہنے لگی کہ کیوں نہ ہم پہاڑ پر رہنے والے سنیاسی بابا کے پاس جائیں۔ سنیاسی بابا مہینے میں ایک دفعہ پہاڑ سے اُتر کر جڑی بوٹیاں بیچنے آیا کرتا تھا۔ تزئین کی یہ ترکیب سن کر سب خوش ہو گئے اور انہوں نے دوبارہ اپنے پی ٹی کرنے والے جوتے پہنے اور پہاڑ پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ بہت طویل فاصلہ طے کر کے سنیاسی بابا کی کٹیا تک پہنچے۔ سنیاسی بابا کی کٹیا ہر قسم کی جڑی بوٹی کی خوشبو سے مہک رہی تھی، بلکہ مختلف مصالحوں کی خوشبو سے انہیں بھوک لگ رہی تھی۔ کٹیا کی چھت سے مصالحوں کی بھری کچی مٹی سے بنی ہانڈیاں لٹک رہی تھیں اور واحد الماری میں مصالحوں سے بھرے مرتبان رکھے ہوئے تھے لیکن سنیاسی بابا کٹیا میں موجود نہیں تھے۔ وہ کوئی قدرتی جڑی بوٹیاں تلاش کرنے نکلے ہوئے تھے۔ چوں کہ بچے پی ٹی کرنے والے جوتے پہنے ہوئے تھے اور انہیں بابا کی تلاش میں مزید چڑھائی چڑھنی پڑی لیکن انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ آخرکار انہوں نے سنیاسی بابا کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ انہوں نے بابا کو اپنی دکھ بھری داستان سنائی کہ کس طرح ان کی امی جان نے اپنی کافی میں نمک ڈال بیٹھی تھیں اور کس طرح کیمیاگر نے اس کافی میں مختلف محلولات ڈال کر اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے اور اب اسے امی تو بالکل ہی نہیں پی سکیں اور اب وہ آپ کی مدد لینے آئے ہیں۔ سنیاسی بابا نے ان کی مدد کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس نے اپنا جھولا شانے پر لادا۔ کٹیا سے اس جھولے میں مختلف جڑی بوٹیاں اور مصالحے ڈالے اور بچوں کے ساتھ ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر بیگم الیاس شدت سے کافی کی طلب محسوس کر رہی تھیں۔ جیسے ہی سنیاسی بابا گھر پہنچا اس نے آگ جلائی۔ اس پہ کافی چڑھا کر اس میں مختلف جڑی بوٹیاں ڈالنے لگا۔ اس نے کافی میں چھیل کر لہسن اور ادرک ڈالا۔ پھر ایک درخت کے تنے سے حاصل کردہ گوند ڈالی۔ پھر اس میں چاروں مغز ڈالے۔ اس کے بعد پسے ہوئے سوکھے دھنیے کی باری تھی۔ ہر طرح کی مرچیں سرخ، سبز، کالی سب کافی میں ڈال لیں۔ ہر چیز ڈالنے کے بعد بچے کافی کا ذائقہ چکھتے رہے اور منہ بناتے رہے۔ سنیاسی بابا نے اجوائن ڈالی، جائفل جاوتری ڈالی لیکن جیسے جیسے وہ جڑی بوٹیاں ڈالتے جا رہے تھے، کافی کا ذائقہ بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر سنیاسی بابا نے سر ہلایا۔ منہ میں کچھ الفاظ بدبدائے اور پھر واپسی کی اجازت مانگی۔ اسے یقین تھا کہ کافی پر کسی نے جادو وادو کر دیا ہے۔ اب کافی دیر ہو چکی تھی اور بیگم الیاس کو کافی پینا نصیب نہیں ہوا تھا۔ سنیاسی بابا نے اپنی مزدوری لی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اب سارا خاندان مایوس تھا۔ سب نے دوبارہ سر جوڑے اور کچھ دیر سوچا۔ آخر اس دفعہ عتیق بولا کہ شہر سے بیگم عروج کے گھر ایک بہت تعلیم یافتہ خاتون آئی ہیں۔ سنا ہے وہ بہت عقل مند ہیں۔ ہمیں ضرور انہیں مل کر انہیں اپنی الجھن بتانی چاہیے۔ اس دفعہ پھر بچے تیار ہوئے لیکن اس دفعہ پی ٹی والے جوتے پہننے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ نزدیک ہی جانا تھا۔ بچے بیگم عروج کے گھر گئے اور ان کی مہمان خاتون کو اپنی رام کہانی سنائی کہ کس طرح بیگم الیاس نے کافی میں نمک ڈال لیا۔ کس طرح ایک کیمیا گر ان کے گھر آ کر کافی کے ساتھ مختلف محلولات سے تجربات کرتا رہا لیکن کافی کو درست نہیں کر سکا اور کس طرح سنیاسی بابا پہاڑ سے اتر کر ان کے ساتھ آیا اور اس نے کافی کے ساتھ کتنی محنت کی لیکن وہ اسے پینے کے قابل نہ بنا سکا۔ مہمان خاتون نے بڑے تحمل، بردباری اور توجہ سے ساری کہانی سنی اور پھر بولیں۔ ''تو آپ لوگ اپنی امی کو کافی کا نیا کپ کیوں نہیں بنا دیتے۔'' بچے منہ کھولے سوچ رہے تھے کہ بس اتنی سی بات تھی۔ پھر اچانک وہ چلائے۔

''ارے واہ! ہم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں سوچی۔''

پھر وہ جلدی سے گھر کی طرف بھاگے اور امی کو نئی کافی بنا کر دی جو بڑی دیر سے کافی پینے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

اس کہانی سے بچو! مجھے تو ایک ضرب المثل، بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں، یاد آ رہی ہے۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ سوچے سمجھے بغیر کسی کام کا آغاز کر دیتے ہیں جس سے ایک چھوٹی سی مشکل بھی بڑی ہو جاتی ہے اور جو لوگ ہر کام میں منصوبہ بندی کر لیتے ہیں ان کے لیے بڑی مشکلیں بھی چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ ☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ فروری 2016ء ہے۔

جنوری 2016ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، ان میں سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، ان عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- بچو بچو! ڈگڈگی آئی، بندر بھالو کا تماشا لائی (اریب طاہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ)
- ناچا بندر تو بچے بھی گانے لگے، تالیاں پھر خوشی سے بجانے لگے (جہان مرزا، حیدرآباد)
- دوستی کی دیکھو ایسی بھی مثال ہے بھالو اور بندر میں اچھی دھمال (محمد اسد عرفان، پشاور)
- مداری والا آیا بیتے دنوں کی یادیں لایا (محمد حسن محمود، لاہور)
- بھالو اور بندر لایا مداری والا، اسے ہی کہتے ہیں اندھیرا اجالا (نجم السحر، منڈی بہاؤ الدین)

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

بیدر تکریم مختار، لاہور (پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

مومنہ عامر حجازی، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

ہادیہ عامر، سرگودھا (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

ردیجا اقبال، چکوال (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

طلحہ صفی، چکوال (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام: [illegible]

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

فروری کا موضوع: وادیٔ کشمیر
آخری تاریخ 8 فروری

مارچ کا موضوع: یوم پاکستان
آخری تاریخ 8 مارچ